اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

جولائی ۲۰۱۲ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان

جلد۱۶، شمارہ ۷ جولائی ۲۰۱۲ء/ شعبان و رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ

مشمولات

○فکر و نظر		
انقلاب بذریعہ سماجی تبدیلی	مدیر	۲
○پاکستانیات		
انقلاب بذریعہ سماجی تبدیلی کا لائحہ عمل	مدیر	۳
○ہمارا دینی تناظر		
زوال امت میں علماء کا کردار	ڈاکٹر محمود احمد غازی	۱۸
○تزکیۂ نفس		
روزے کی آفات اور ان کا علاج	مولانا امین احسن اصلاحی	۲۶
روزے کے طبی فوائد	ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی	۳۱
○اسلام اور سائنس		
سائنس اور ہماری ترجیحات	وسیم الطاف	۳۴
○استفسارات		
کیا آپ کو مغرب فوبیا ہو گیا ہے؟	مدیر	۳۸
خلیفہ اور خلافت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟		۴۱
○بزم قارئین		
اسلام اور سائنس	آفتاب عروج	۴۵
عمران خان اور نواز شریف	عرفان احمد	۴۶
○تبصرہ کتب		
قرآن اور مغرب از کینتھ کریگ	ڈاکٹر مظفر اقبال	۵۱
تالیفات مدیر		۵۴

انقلاب بذریعہ سماجی تبدیلی

پاکستانی معاشرے کو انسانوں کے رہنے کے قابل بنانے کے لیے اور اسے اخلاقی و مادی زوال سے نکالنے کے لیے بلکہ اس ڈوبتے جہاز کو بچانے کے لیے اصلاح وخدمت کی ایک زبردست قومی تحریک شروع کرنے کی ضرورت ہے جس کی بنیاد اسلامی اصول واقدار ہوں۔ جو دینی تحریکیں ہمارے معاشرے کی اخلاقی اصلاح کے لیے کوشاں ہیں (جیسے تبلیغی جماعت، دعوت اسلامی......وغیرہ) اور جو دینی سیاسی تنظیمیں ملک میں بذریعہ انتخابات اسلامی نظام زندگی کے نفاذ کے لیے کوشاں ہیں (جیسے جمعیت علماء اسلام، جماعت اسلامی......وغیرہ) یا غیر انتخابی جدوجہد کر رہی ہیں (جیسے جماعت الدعوۃ و تنظیم اسلامی......وغیرہ) یا اس غرض سے غلبۂ شریعت کے لیے مسلح جدوجہد کر رہی ہیں (جیسے تحریک طالبان ......وغیرہ) ان سب کی کوششوں کے جو نتائج نکلے ہیں، وہ ہم سب کے سامنے ہیں کہ بگاڑ کی قوتیں اتنی طاقتور ہو چکی ہیں کہ انہوں نے مذکورہ بالا کوششوں کو منہدم کرتے ہوئے معاشرے کو مغرب پرستی، بے دینی، بداخلاقی، کرپشن، بے حیائی اور دنیا پرستی کے راستے پر ڈال دیا ہے جس سے نہ صرف فرد بے سکون ہے اور معاشرہ ابتری کی حالت میں ہے بلکہ آخرت کا خسارہ بھی سامنے نظر آ رہا ہے۔

اندریں حالات ہم اہل فکر ونظر کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ سماجی تبدیلی کے لیے اصلاح وخدمت کی ایک قومی تحریک شروع کرنے کی ہماری تجویز پر سنجیدگی سے غور فرمائیں۔ ہم دوسرے طریقے آزما چکے اور ان کے نتائج بھی دیکھ چکے۔ حالات کو سنوارنے کے لیے ہمیں مزید کچھ کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ سول سوسائٹی کے وہ لوگ جو اس مغرب زدہ اور اخلاقی و مادی لحاظ سے زوال پذیر معاشرے میں اسلامی اصول واقدار کے وسیع تر فریم ورک میں، مثبت تبدیلی لانے کے خواہاں ہیں وہ منظم اور متحرک ہو جائیں اور اس معاشرے کو بدلنے کی جدوجہد کریں۔

ہم نے اس موضوع پر ایک تفصیلی مقالہ البرہان شمارہ مارچ ۲۰۱۲ء میں 'آیئے! اس معاشرے کو بدل دیں' کے عنوان سے لکھا تھا جو ہم نظر ثانی کے بعد مع تلخیص کے دوبارہ شائع کر رہے ہیں تاکہ قارئین کی توجہ حاصل کر سکیں۔

پاکستانیات

ڈاکٹر محمد امین

انقلاب بذریعہ سماجی تبدیلی کا لائحہ عمل

پاکستانی معاشرے کو بدلنے کے لیے اصلاح و خدمت کی ایک قومی تحریک کی ضرورت ہے

تلخیص

کسی بھی معاشرے کو زوال سے بچانے اور نکالنے میں سیاسی اور دینی قیادت اہم کردار ادا کرتی ہےلیکن پاکستانی معاشرہ اس وقت اخلاقی و مادی لحاظ سے جس زبوں حالی کا شکار ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری سیاسی قیادت نے معاشرے کو ڈبونے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور ہماری دینی قیادت اسے سنبھالنے میں کامیاب نہیں ہوسکی اور بگاڑ کی قوتیں اتنی طاقتور ہوچکی ہیں کہ وہ معاشرے کو مغرب پرستی اور تباہی کے راستے پر بگٹٹ دوڑائے چلی جارہی ہیں۔

ان دونوں قیادتوں کی عمومی ناکامی کے بعد (اگرچہ ان دونوں میں انفرادی طور پر اچھے لوگ بھی موجود ہیں) اب باقی لوگوں کا کیا یہی کام ہے کہ وہ اس ڈوبتے جہاز کو دیکھتے رہیں اور ٹس سے مس نہ ہوں؟ جب کہ ان کا اپنا مقدر بھی اسی جہاز سے وابستہ ہے۔ اس کا حل ہمارے نزدیک صرف یہ ہے کہ سول سوسائٹی کے وہ افراد جو اسلامی اصول و اقدار کے قابل عمل ہونے اور مسائل حل کرسکنے کی صلاحیت پر یقین رکھتے ہیں، وہ متحد و منظم ہوجائیں اور غیر سیاسی سطح پر سماجی تحریک و تنظیم کے ذریعے معاشرے میں سماجی تبدیلی کے ذریعے انقلاب برپا کرنے کے لیے متحرک ہوجائیں۔

سماجی تبدیلی لانے کا لائحہ عمل دو جہتوں پر مبنی ہوسکتا ہے: ایک اصلاح اور دوسرے خدمت خلق۔

اصلاح کے لیے ہم نے تین نکات تجویز کیے ہیں: **ایک** موجودہ نظام تعلیم و تربیت کی اصلاح، **دوسرا** تعلیم و تربیت کے غیر رسمی ذرائع خصوصاً میڈیا کی اصلاح اور **تیسرا** اصلاح اخلاق۔

اسی طرح ہم نے خدمت خلق کے لیے بھی تین نکات تجویز کیے ہیں: **ایک** افلاس کم کرنے کی کوششیں۔ **دوسرا:** انصاف مہیا کرنے میں ہاتھ بٹانا اور **تیسرا** امن و امان بحال کرنے میں کردار ادا کرنا۔

ان نکات کی تفصیل اگلے صفحات میں موجود ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سارے کام پرائیویٹ سیکٹر میں آئین و قانون کے اندر رہتے ہوئے غیر سیاسی انداز میں اور کسی قسم کی فرقہ واریت میں ملوث ہوئے بغیر محض معاشرتی تحریک و تنظیم کے ذریعے سرانجام دیے جاسکتے ہیں۔ سماجی تبدیلی کے لیے اگر ہم اس طرح کی ایک تحریک قائم کرنے اور چلانے میں کامیاب ہوجائیں تو بغیر کشت و خون کے اور بغیر سیاسی اقتدار کے، پاکستان میں ایک پرامن سماجی انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے، ان شاء

اللہ۔

انقلاب بذریعہ سماجی تبدیلی کا لائحہ عمل

سول سوسائٹی کا کردار

اگرچہ روایتی طور پر مسلم معاشرے میں دینی اور سیاسی قیادت کا کردار اہم تر تسلیم کیا جاتا ہے لیکن عصر حاضر میں معاشرے کے جو اجزائے ترکیبی سامنے آئے ہیں ان میں سول سوسائٹی کے دیگر طبقات کی اہمیت بھی بڑھ گئی ہے۔

الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے صحافیوں اور ادیبوں کا کردار رائے عامہ کی تشکیل اور عامۃ الناس کی ذہن و کردار سازی میں اتنا بڑھ گیا ہے کہ اسے انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کے ساتھ ریاست کا چوتھا ستون کہا جانے لگا ہے۔ اسی طرح تاجر اور صنعت کار اور ان کی اختیار کردہ معاشی پالیسیاں خصوصاً ان کی مال خرچ کرنے کی پالیسی بھی معاشرتی رویوں اور اداروں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ابھی ماضی قریب میں پاکستان میں وکلاء نے اعلیٰ عدلیہ کی بحالی کے لیے جو کامیاب اور منظم مہم چلائی وہ ہم سب کے ذہنوں میں تازہ ہے۔ اسی طرح تحریک پاکستان میں اور بعد میں بھٹو صاحب کے زمانے میں بنگلہ دیش کی نامنظوری کے خلاف طلبہ نے جو کامیاب مہم چلائی اس سے بھی ہم واقف ہیں۔

خلاصہ یہ کہ معاشرے میں تبدیلی لانے میں اگرچہ سیاسی اور مذہبی قیادت کا کردار روایتی طور پر نمایاں حیثیت کا حامل سمجھا جاتا ہے لیکن معاشرے پر اثر انداز ہونے میں اب سول سوسائٹی کے دیگر عناصر بھی فعال اور قائدانہ کردار ادا کرتے ہیں جن میں دانشور، ادیب، صحافی، تاجر، صنعت کار، طلباء، وکلاء، پروفیسرز، ڈاکٹرز اور انجینئرز وغیرہ شامل ہیں۔ زیر بحث عنوان کے حوالے سے اس بات کا مطلب یہ ہے کہ فرد اور معاشرے کی اصلاح میں اگرچہ روایتی طور پر دینی اور سیاسی قیادت کا کردار اہم ہے لیکن یہ دونوں قیادتیں بوجوہ اگر اپنا کام نہ کریں یا مؤثر انداز میں یہ ذمہ داری ادا نہ کرسکیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فرد اور معاشرے کو شتر بے مہار چھوڑ دیا جائے بلکہ سول سوسائٹی کے دینی شعور اور ملی درد رکھنے والے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ یہ فریضہ ادا کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو کیونکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے یہ ہر مسلمان کی ذاتی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اصلاح کے ساتھ معاشرے کی اصلاح کے لیے بھی کوشش کرے۔

اصلاح معاشرہ — ہر مسلمان کی ذاتی ذمہ داری

سوسائٹی سٹرکچر سے قطع نظر ہم چونکہ مسلمان ہیں اور جس نظریۂ حیات پہ ایمان و یقین رکھتے ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم دنیا کی یہ زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزاریں تاکہ آخرت میں وہ ہم سے

راضی ہو جائے اور اپنی نعمتوں سے نوازے۔ اس تصور کا مطلب یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص انفرادی طور پر اللہ تعالیٰ کو جواب دہ ہے اور ہر آدمی کو قبر میں اور یوم حشر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنا ہے لہٰذا اسلامی احکام پر عمل کرنا اور ان کے مطابق زندگی گزارنا ہر فرد کی شخصی ذمہ داری ہے۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ اجازت نہیں کہ وہ محض انفرادی زندگی گزاریں بلکہ انہیں یہ حکم ہے کہ جہاں تک ممکن ہو وہ ایک منظم معاشرہ تشکیل دیں اور جب ایسا معاشرہ وجود میں آ جائے تو اسے اپنے نظریہ حیات کے مطابق چلائیں اور اگر نہ چل رہا ہو تو اس کی اصلاح کی کوشش کریں کیونکہ صالح اجتماعیت ضروری ہے اور اس لیے ضروری ہے کہ وہ فرد کو اسلام پر چلنے میں مدد دے اور اس کا ساتھ دے۔ ظاہر ہے کہ معاشرے کی قوت اگر فرد کے ساتھ نہ ہو یا خدانخواستہ اس کی مخالف ہو تو فرد کا اسلامی احکام پر پوری طرح عمل کرنا ممکن ہی نہیں رہتا۔ اس لیے مسلم معاشرہ اگر اپنی اسلامی ذمہ داریاں پوری طرح ادا نہ کر رہا ہو تو پھر یہ ہر مسلمان کی ذاتی دینی ذمہ داری ہے کہ جہاں تک ہو سکے وہ اس کی اصلاح کی کوشش کرے اور اسے اسلامی اصولوں پر قائم کرے اور رکھے کیونکہ اسی میں آخر کار اس کی اپنی ذاتی فلاح بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح احادیث میں بار بار حکم دیا ہے کہ مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہونے چاہئیں جو لوگوں کو دین سکھائیں، نیکی کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں۔ یہاں حکم عامۃ المسلمین کو ہے نہ کہ کسی خاص طبقہ کو اور ویسے بھی فقہاء کرام جب کسی کام کو فرض کفایہ کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عامۃ المسلمین میں سے کچھ لوگ اگر اس فرض کو اس طرح ادا کر دیں کہ شارع کا مقصد حاصل ہو جائے تو گویا سارے مسلمانوں پر جو فرض عائد ہوتا تھا وہ ادا ہو گیا لیکن اگر کچھ لوگوں کے فرض ادا کرنے کے باوجود شارع کا مطلوب حاصل نہ ہو تو یہ فرض دوسرے لوگوں پر بدستور فرض رہے گا اور ہر فرد مسلم کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ یہ فرض ادا کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ اس حالت کو ہم ہر مسلمان کی ذاتی ذمہ داری قرار دے رہے ہیں۔ اس کی بہترین مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فرمان گرامی ہے جس میں آپؐ نے عامۃ المسلمین کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ’**بلغوا عنی ولو آیۃ**‘ یعنی لوگوں تک پہنچاؤ خواہ ایک آیت ہی ہو۔ خلاصہ یہ کہ مسلم معاشرے کی ایسی اصلاح کہ وہ اپنی اسلامی ذمہ داریاں موثر طور پر ادا کرے، ہر مسلمان کی ذاتی ذمہ داری ہے اور اسی کو شرعی اصطلاح میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور دعوت و تبلیغ کہا جاتا ہے جس کی شکلیں ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہیں۔

پاکستان کے موجودہ حالات

یہ تو ایک تمہیدی اور اصولی گفتگو تھی لیکن اگر ہم پاکستان کے حالات پر ایک معروضی نظر ڈالیں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ یہاں فرد مسائل و مشکلات کا شکار اور معاشرہ روبہ زوال کیوں ہے؟ تو ہم بآسانی اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ اس صورت حال کا بڑا سبب یہ ہے کہ سیاسی قیادت معاشرے اور ریاست کو اسلامی اصولوں کے مطابق چلانے میں ناکام ہو چکی ہے اور دینی قیادت بھی اس کا پیدا کردہ خلاء پورا نہیں

کرسکی اور معاشرے اور ریاست کی اصلاح کرنے اورانہیں اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے قابل بنانے میں مؤثر کردار ادا نہیں کرسکی لہٰذا اب اس خلاء کو پورا کرنے کی یہی صورت باقی بچی ہے کہ سول سوسائٹی کے باشعور، دین دار اور تعمیری سوچ رکھنے والے عناصر آگے آئیں اور معاشرے کی قیادت کریں۔ ہمارے خیال میں اس موقف کو وضاحت سے بیان کرنے کی ضرورت ہے:

سیاسی اور دینی قیادت کی ناکامی

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے — گو تلخ سہی — کہ ہمارے سیاسی قائدین کی اکثریت (الّا ما شاءاللہ) نہ صرف آخرت کی فکر سے عاری اور دینی احکام پر عمل سے محروم ہے بلکہ اپنی اجتماعی اور معاشرتی ذمہ داریوں سے بھی غافل ہے۔ وہ نہ صرف مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب ہوکر اس کی پیروی کرتی ہے اور دنیاوی مفاد واقتدار کے لیے اسلام اور مسلم دشمن ممالک (خصوصاً امریکہ ویورپ) کی مرضی پر چلتی ہے بلکہ ان کی گماشتہ اور ایجنٹ بن کر مسلمان عوام کو بھی ان کے الحادی راستے پر چلانا چاہتی ہے۔ وہ قوم کو مکہ اور مدینہ کی بجائے نیویارک اور واشنگٹن کی راہ پر لے جانے کے لے ریاست وحکومت کے سارے وسائل استعمال کررہی ہے۔ یوں وہ تعمیر کی بجائے تخریب اور لوگوں کی مشکلات ومسائل کو حل کرنے کی بجائے انہیں پیدا کرنے اور بڑھانے میں لگی ہوئی ہے۔ وہ اپنے ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دیتی ہے اور اقتدار کے لیے ملک توڑنے سے بھی گریز نہیں کرتی۔ عوام کے پیسے لوٹ کر مغربی بنکوں میں جمع کرتی ہے اور اقتدار اور ڈالروں کے لیے ملک بیچنے اور اسے غلامی کے گڑھے میں دھکیلنے سے بھی باز نہیں آتی۔

سیاسی قیادت کی ناکامی کے بعد دینی قیادت کا فرض تھا کہ وہ اس کے پیدا کردہ خلاء کو پورا کرنے کی کوشش کرتی لیکن بدقسمتی سے وہ بھی ریاست اور معاشرے کی اصلاح کرنے میں ناکام ہوگئی ہے۔ جن دینی عناصر نے سیاسی جدوجہد کی راہ اپنائی وہ مسلک کی بنیاد پر سیاسی جہدوجہد کرنے، آپس کے انتشار، اخلاقی ساکھ قائم نہ کرپانے، غیر مؤثر پالیسیاں اپنانے اور عوام کی سیاسی حمایت حاصل نہ کرسکنے کی بناء پر کامیاب نہیں ہوسکے اور جن عناصر نے تعلیم وتدریس اور دعوت واصلاح کا راستہ اختیار کیا وہ بھی غیر مؤثر رہے کیونکہ ان کی تعلیمی پالیسی بھی مسلک پرستی، عصری علوم سے عدم اعتناء، نصاب کی قدامت، جدید مسائل اور مغربی تہذیب سے صَرف نظر کرنے کی وجہ سے ناقص تھی اور دعوت واصلاح کی حکمت عملی بھی دین کے ناقص تصور اور عصری تقاضوں کا لحاظ نہ کرنے کی وجہ سے نامکمل تھی۔ نیز انہوں نے عوام کے مسائل اور مصائب ومشکلات دور کرنے میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔ یوں سیاسی قیادت کی ناکامی سے معاشرے میں جو خلاء پیدا ہوا تھا اسے پورا کرنے میں دینی قیادت بھی ناکام رہی۔ ان میں سے بہت سے لوگ اگرچہ اپنی سمجھ کے مطابق دین پر چلنے اور معاشرے کو دین پر چلانے کی سعی بھی کررہے ہیں لیکن ان کی کوششیں تھوڑی بھی ہیں اور ناقص بھی اور مؤثر طریقے سے کام کرنے کے بہت سے پہلو اور طریقے

ایسے ہیں جن کی طرف ان کی توجہ اور التفات نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کا کام غیر مؤثر اور نتیجہ خیزی سے دور ہے اور معاشرہ مسلسل دین سے دور اور دنیاوی لحاظ سے ناکام ہوتا چلا جا رہا ہے۔

سول سوسائٹی کی ذمہ داری

سوال یہ ہے کہ اِن حالات میں جب کہ سیاسی قیادت اپنے فرائض کی ادائی میں ناکام رہی ہے اور دینی قیادت بھی اپنی ناقص پالیسیوں اور غیر مؤثر حکمت عملی کی وجہ سے کوئی نتیجہ خیز کام نہیں کرسکی تو آخر اس معاشرے کا والی وارث کون ہوگا؟ اس کو بچانے کی اور اس کی اصلاح وتعمیر کی کوشش کون کرے گا؟

ہم نے اس تحریر کے شروع میں کئی مثالیں دے کر واضح کیا تھا کہ ہماری سول سوسائٹی کے عناصر میں، الحمدللہ، ابھی تک جان ہے اور ان میں ایسے قابل، محنتی اور دینی جذبہ وشعور رکھنے والے عناصر ابھی تک موجود ہیں جو غلط اور صحیح کا ادراک رکھتے ہیں اور دنیاوی حالات کی تفہیم اور انہیں صحیح رُخ پر چلانے کے حوالے سے بھی وہ سیاسی اور روایتی دینی لوگوں سے کہیں آگے ہیں، وہ اگر متحد اور متحرک ہو کر اُٹھ کھڑے ہوں تو ان شاء اللہ حالات کو بدل سکتے ہیں۔

اگلا سوال جو منطقی طور پر سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ سول سوسائٹی کے لوگ (یعنی دانشور، ادیب، صحافی، تاجر، صنعتکار، وکلاء، طلباء، پروفیسرز، ڈاکٹرز، انجینئرز وغیرہ) حالات کی کایا کیسے پلٹ سکتے ہیں؟ اور معاشرے کی صحیح رُخ میں تبدیلی کے لیے ان کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم اس سوال کا جواب دیں ضروری محسوس ہوتا ہے کہ پہلے اس بات کا تجزیہ کرلیا جائے کہ ناکامی اور بگاڑ کا سبب کیا ہے؟ کیونکہ جب تک ناکامی، بگاڑ اور فساد کے اسباب ومظاہر کو نہیں سمجھا جائے گا، ان کے صحیح اور مناسب حل تک پہنچنا ممکن نہ ہوگا۔

بگاڑ کے اسباب

ہماری رائے میں سیاسی اور دینی عناصر کی ناکامی اور معاشرے کے فساد وبگاڑ کے قابو نہ آسکنے کے دو بڑے سبب ہیں: ایک ہماری منافقت اور اپنے نظریۂ حیات سے بے وفائی اور دوسرے مغرب کی الحادی اور اسلام ومسلم دشمن تہذیب سے مرعوبیت اور اس کی پیروی۔ ذیل میں ان نکات کی کچھ تفصیل دی جارہی ہے۔

بگاڑ کا بنیادی سبب: نظریۂ حیات سے بے وفائی

۱۔ ہم میں سے ہر فرد یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ مسلمان ہے لیکن عملاً اپنی زندگی اسلامی اصولوں اور تعلیمات کے مطابق نہیں گزارتا۔ ایمان وعمل کا یہ تضاد اور منافقت ہمارے مسائل، مشکلات اور زوال کا بنیادی سبب ہے۔

۲۔ بعض اوقات ہمیں یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ ہم تو نماز پڑھتے اور روزے رکھتے ہیں۔ بہت سے لوگ شلوار قمیض پہنتے ہیں اور انہوں نے داڑھی بڑھائی ہوئی ہے اور بہت سی عورتیں پردہ بھی کرتی ہیں۔ ہماری خوشی وغم اور دوسری بہت سی معاشرتی رسمیں بھی اسلامی ہیں اور دینی اجتماعات میں بھی لاکھوں کا مجمع ہوتا ہے تو ہمیں گمان ہوتا ہے کہ ہم لوگ تو اچھے خاصے مسلمان ہیں اور ہمارا معاشرہ بھی اسلامی ہے۔ یہ دراصل دین کا ناقص تصور ہے۔ اس دین کا یہ تقاضا بھی ہے کہ ہمارا ہمسایہ بھوکا ہو تو نوالہ ہمارے حلق سے نہ اترے۔ اس دین کا یہ تقاضا بھی ہے کہ ہم مظلوم، مجبور اور مقہور کا ساتھ دیں۔ اسی دین کا یہ تقاضا بھی ہے کہ ہم جھوٹ نہ بولیں، رشوت نہ لیں، کرپشن نہ کریں، قانون نہ توڑیں، کسی کا حق نہ ماریں۔ اس کا یہ تقاضا بھی ہے کہ ہم محبتیں بانٹیں اور نفرت وتعصب نہ پھیلائیں اور افتراق وانتشار سے بچیں۔ حاصل یہ کہ جو چیز ہماری نظر سے اوجھل ہو چکی ہے وہ یہ کہ ہمارا معاشرہ حسنِ توازن سے پورے دین پر عمل سے محروم ہو چکا ہے اور ہم چند مذہبی رسموں پر عمل کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم اچھے مسلمان ہیں جب کہ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔

۳۔ قرآن مسلمانوں سے علی الاعلان اور حتمی وعدہ کرتا ہے 'وانتم الاعلون' یعنی تمہی غالب اور بالادست رہو گے لیکن ساتھ شرط لگاتا ہے کہ 'ان کنتم مومنین' اگر تم مومن ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج اگر ہم دنیا میں کمزور، بھوکے، ننگے، بے وقعت اور بے وزن ہیں تو درحقیقت ہم مومن نہیں ہیں۔ سچا مومن بننے سے غلبہ وعروج کیسے مل جاتا ہے؟ آئیے غور کریں۔

قوموں کے عروج وزوال کا مطالعہ اگر ہم قرآن وسنت کی روشنی میں کریں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ جب فرد اپنے نظریۂ حیات سے — خواہ وہ کچھ بھی ہو — خالص اور مکمل وابستگی اختیار کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں اس کے اندر وہ بنیادی اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں جو اس دنیا میں حصول اسباب کے لیے ضروری ہیں جیسے محنت کی عادت، ایثار، تنظیم اور منصوبہ بندی، اطاعت امیر، پابندیٔ قانون۔۔۔وغیرہ۔ جب یہ خصوصیات کسی قوم کے افراد میں پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ قوم دنیا میں ترقی کرنے لگتی ہے اور اگر کوئی اس سے بہتر نظریۂ حیات اور اس پر مقابلتاً زیادہ یکسوئی اور کمٹمنٹ سے کاربند قوم موجود نہ ہو تو وہ دوسروں پر غالب بھی آجاتی ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو افراد تیار کیے چونکہ ان کا نظریۂ حیات بھی منزّل من اللہ، فطری اور صحیح تھا اور وہ اس پر پوری یکسوئی اور کمٹمنٹ کے ساتھ عامل بھی تھے لہٰذا ان کے اندر وہ صلاحیتیں اور اوصاف پیدا ہو گئے جو دنیا میں حصول اسباب کے لیے ضروری ہیں چنانچہ وہ دنیاوی معاملات میں بھی ساری قوموں سے آگے نکل گئے اور جب تک ان میں وہ اوصاف غالب رہے دنیا میں کوئی ان کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اِس وقت مسلمان اس لیے خوار و زبوں اور زوال پذیر ہیں کہ ان کے افراد کی اکثریت اپنے دین اور نظریۂ حیات پر یکسو اور اس سے کمٹڈ نہیں ہے چنانچہ ان کے اندر وہ صلاحیتیں اور وہ اوصاف پیدا ہی نہیں ہو پا رہے جو اس دنیا میں ترقی کے لیے ضروری ہیں۔

۴۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ اگر مسلم معاشرے کے کچھ افراد دین کے کچھ حصے پر کما حقہ عمل کریں بھی تو اس کا کوئی مثبت اور انقلابی نتیجہ نکل سکتا کیونکہ گھڑی صرف اسی وقت ٹھیک ٹائم دیتی ہے جب اس کے سارے پرزے ٹھیک کام کررہے ہوں، چند پرزوں کے ٹھیک کام کرنے سے گھڑی صحیح وقت نہیں دے سکتی۔اسی طرح چند فی صد لوگوں کے اچھا ہونے سے مسلم معاشرہ درست اور طاقتور نہیں ہوسکتا جب تک کہ افراد معاشرہ کی اکثریت نہ بدلے اور اسلام کے مطابق عمل نہ کرے۔

اور یہ درستگی اور اطاعت صرف نماز روزے، داڑھی اور شلوار قمیض تک محدود نہیں ہونی چاہیے بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں اور فرد کے ہر رویے میں ہونی چاہیے کہ اسلام نام ہی مکمل سپردگی اور بلا حدود و شرائط اطاعت کا ہے نہ کہ جزوی تابعداری اور ادھوری اطاعت کا۔

بگاڑ کا دوسرا بڑا سبب: مغربی فکر و تہذیب کی پیروی

۱۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے کہ یہودی و نصاری تمہارے دشمن ہیں اور تمہیں دین سے پھیرنا چاہتے ہیں۔مسلم امت کا تجربہ اور مشاہدہ اس قرآنی حقیقت کی تائید کرتا ہے۔یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز مسلمانوں سے جذبۂ انتقام کی خاطر ہوا تھا جب ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کے عیسائی ہیڈکوارٹر پر قبضہ کیا تو پادری سارے یورپ میں پھیل گئے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف لوگوں کے جذبات بھڑکائے، انہیں انتقام پر اکسایا اور مسلمانوں سے مقابلے اور ان کی تباہی کے لیے لوگوں کو ابھارا۔یہی جذبہ تحریک نشاۃ ثانیہ کی بنیاد بنا۔اہل یورپ نے مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیں، ان کے درمیان پھوٹ ڈالی اور جب وہ کمزور ہوگئے تو انہیں طاقت سے کچل ڈالا، ان کے ملکوں پر قبضہ کیا، انہیں غلام بنایا، ان کے وسائل لوٹ لیے اور ان کے سارے اجتماعی ادارے توڑ اور گرا کر اپنے اصولوں اور اپنی تہذیب کے مطابق مسلم معاشرے کے سارے اداروں کی تعمیر نو کی۔اس طرح انہوں نے صرف علاقے فتح نہیں کیے بلکہ لوگوں کے دل و دماغ بھی فتح کیے اور ان کو فکری اور ذہنی طور پر بھی غلام بنایا۔

جب آپس کی دو عظیم جنگوں کے بعد مغربی ممالک کمزور ہوگئے اور مسلمان ممالک کو آزادی دینے پر مجبور ہوگئے تو اب استعمار نے چولا بدل لیا اور مسلمان ممالک کو اپنا ذہنی غلام بنانے اور کمزور و دست نگر رکھنے کے لیے اس نے نئی منصوبہ بندی کی۔اس کے لیے اہل مغرب نے مسلم حکمرانوں کو اپنا ایجنٹ بنایا، تعلیم، میڈیا اور ذہن سازی کے دوسرے پُر امن ذرائع استعمال کیے، معیشت کو امداد اور قرضوں میں جکڑا۔علماء، سیاستدانوں اور مختلف طبقوں کو باہم لڑایا، فوجی آمریتوں کے ذریعے سیاسی عدم استحکام پیدا کیا—— لیکن یورپ و امریکہ اور یہودیوں کی اس طرح کی ساری کوششوں اور سازشوں کے باوجود کچھ مسلم ممالک مضبوط ہوگئے۔پاکستان نے ایٹم بم بنالیا، عراق نے مضبوط فوج کھڑی کرلی، ملائیشیا معاشی طور پر مستحکم

ہو گیا، افغانستان نے ٹھیٹھ اسلامی نظام اپنالیا تو یہ سب مغرب سے برداشت نہ ہو سکا اور اس نے جھوٹے پروپیگنڈے اور سازشوں کی بنیاد پر پہلے عراق کو کچلا، پھر افغانستان کا تورابورا بنایا، لیبیا کو تباہ و برباد کیا اور اب پاکستان پر حملے اور شام و ایران پر دباؤ جاری ہے۔ یوں امریکہ و یورپ کی اسلام و مسلم دشمنی ایک واضح حقیقت ہے اور صرف ان کو نظر نہیں آتی جو آنکھوں کے اندھے ہیں یا چیزوں کو مغرب کی عینک سے دیکھتے ہیں۔

۲۔ چونکہ پاکستان میں حکمران، بیوروکریسی، میڈیا، نظام تعلیم اور دوسرے شعبے مغربی اثرات اور دباؤ کے تحت مغربی فکر و تہذیب کے فروغ کے لیے کام کرتے ہیں اس لیے مسلمان عوام بھی مغربی فکر و تہذیب سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور اس مغالطے اور غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ چونکہ مغرب کی تہذیب ترقی یافتہ، غالب اور بالادست ہے اور اس کی وجہ مغربی فکر اور اصولوں کی پیروی ہے لہٰذا اگر مسلمان ترقی کرنا چاہتے ہیں تو انہیں بھی مغربی فکر اور اصولوں کی پیروی کرنی چاہیے۔ یہ بات اس لیے غلط ہے کہ مغربی تہذیب کے اصول و مبادی اسلامی تہذیب کے اصول و مبادی سے نہ صرف مختلف ہیں بلکہ ان سے متضاد ہیں۔ اسلام کا عقیدہ اور ورلڈ ویو مغرب سے بالکل مختلف ہے۔ اسلام میں توحید کا تصور ہے کہ اللہ خالق و مالک، رب، مطاع، رازق سب کچھ ہے اور انسان اس کا عبد ہے جس کا کام اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت ہے۔ یہ دنیا دارالعمل ہے اور اس کے بعد ایک دوسری دنیا آئے گی جس میں موجودہ زندگی میں اس کے کیے گئے اعمال کا نتیجہ نکلے گا اور یہ کہ آخرت دنیا سے اہم تر ہے اور یہ کہ انسان کی ہدایت کا انحصار اس وحی پر ہے جو اللہ تعالیٰ پیغمبروں کے ذریعے انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں مغربی تہذیب کی بنیاد ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور ایمپیریسزم وغیرہ پر ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان مختار مطلق ہے، وہ کسی اِلٰہ کا عبد نہیں خصوصاً اجتماعی زندگی اور ریاست کے امور میں خدا کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہیے۔ زندگی بس اس دنیا کی زندگی ہے اور آخرت کسی نے نہیں دیکھی۔ علم اور حقائق کا منبع انسانی عقل اور انسانی تجربہ و مشاہدہ ہے۔ ظاہر ہے مغربی تہذیب کے یہ اصول اسلامی تعلیمات کے خلاف اور ان سے متضاد ہیں لہٰذا اسلامی تہذیب کے ماننے والے مغربی تہذیب کے اصولوں کو نہیں مان سکتے اور نہ ان کے مطابق زندگی گزار سکتے ہیں اور اگر ایسا کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ اجتماع ضدین ہوگا جبکہ دو متضاد چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں اور ہو جائیں تو مثبت نتائج نہیں دے سکتیں۔

۳۔ مسلمان جو کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوتے ہیں یعنی **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** اس میں نفی پہلے ہے اور اثبات بعد میں۔ یعنی جب تک دوسرے (جعلی) خداؤں کی نفی نہ کی جائے ایک سچے خدا کی عبادت و اطاعت بے معنی ہے لہٰذا ایک مسلمان کے لیے دوسرے خداؤں کا انکار لازمی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان کو یکسو اور حنیف ہونا چاہیے، اسلام کی مکمل اطاعت کرنی چاہیے اور اسلام کے سوا جو کچھ بھی اس سے متضاد ہے اسے رد کر دینا چاہیے۔

۴۔ مغرب کی تہذیب صرف دنیا سنوارتی ہے جب کہ اسلام کی تہذیب دنیا اور آخرت دونوں سنوارتی ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان اللہ و رسول کی مکمل اطاعت کریں۔ اگر وہ مغربی اصولوں کی پیروی کریں گے تو ان کی دنیا بھی برباد ہو جائے گی اور آخرت بھی کیونکہ اس کے اصول اسلامی اصولوں کے برعکس اور متضاد ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ سول سوسائٹی کے دین دار عناصر کی قیادت اگر پاکستانی معاشرے کی اصلاح کرنا چاہے، اسے ترقی اور عروج سے ہم کنار کرنا چاہے، اس کے مسائل حل کرنا چاہے تو اس کے دو بنیادی اصول ہیں: ایک یہ کہ اسلامی تعلیمات پر عصری ضرورتوں اور تقاضوں کے تناظر میں پوری طرح عمل کیا جائے اور دوسرے یہ کہ مغربی فکر و تہذیب کو رد کر دیا جائے۔

سماجی تبدیلی......مگر کیسے؟

اب اس سے آگے بڑھیے اور یہ سوچیے کہ ان دو اصولوں کو کن اداروں کی شکل دی جائے جن کے ذریعے آج کی سوسائٹی کو بدلا جا سکتا ہے۔ جہاں تک ہم نے اس معاملے پر غور کیا ہے تو اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ سماجی تبدیلی کو ہدف بنایا جائے کیونکہ سطور سابقہ میں ہم وضاحت سے بتا چکے ہیں کہ پاکستان میں مثبت سیاسی تبدیلی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا اور دینی عناصر کی روایتی تدریسی و تبلیغی سرگرمیاں بھی معاشرے کو بدلنے اور اس کے مسائل حل کرنے میں ممد و معاون ثابت نہیں ہو سکیں لہٰذا اب واحد حل جو بچا ہے وہ یہ ہے کہ سول سوسائٹی کے باشعور، تعلیم یافتہ اور دین دار عناصر اُٹھیں اور غیر سیاسی انداز میں، منظم و متحرک ہو کر سماجی تبدیلی کو بار آور بنائیں۔ مذکورہ سماجی تبدیلی لانے کا لائحہ عمل کیا ہو؟ ہم بطور طالب علم قوم کے اہل فکر و نظر کے سامنے یہ تجویز رکھتے ہیں کہ یہ بنیادی طور پر اصلاح و خدمت کی ایک تحریک ہونی چاہیے جس کے لیے تین اصلاحی اقدامات کی ضرورت ہے (تعلیم و تربیت، میڈیا اور اصلاح اخلاق) اور تین ایسے اقدامات کی جن سے معاشرے کے بنیادی مسائل و مشکلات کے حل کی صورت نکلنا شروع ہو جائے یعنی افلاس کا خاتمہ، انصاف کی فراہمی اور امن و امان کی بحالی۔ ان کی کچھ تفصیل یہ ہے:

اصلاحی اقدامات

۱۔ تعلیم و تربیت

تعلیم ہر فرد کی تعمیرِ شخصیت و کردار اور اسی طرح معاشرے کی اصلاح و تعمیر میں اساسی کردار ادا کرتی ہے۔ اس کا بنیادی کام انسان سازی ہے مطلب یہ کہ وہ ایسے افراد تیار کرے جن کا طرزِ فکر و عمل معاشرے کے ان آئیڈیلز کے مطابق ہو جن پر وہ ایمان رکھتا ہے۔ ہمارا موجودہ معاشرہ اور اس کا نظام تعلیم ایسا فرد تیار نہیں کر رہا اور یہی ہمارے معاشرے کی ایک بنیادی خامی اور اساسی کمزوری ہے جو اس

کے عدم استحکام اور زوال کا سبب ہے لہٰذا ہمیں اس کمزوری کو رفع کر کے نظام تعلیم کی تشکیل نو اس طرح کرنا ہے کہ وہ یہ بنیادی کام احسن طریقے سے کرنے لگے۔ بلاشبہ تعلیم کی کثرت مطلوب ہے اور تعلیم عام کرنا ہم سب کا خواب ہے اور ہمیں اس کے لیے جدوجہد کرنا ہے لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ تعلیم کا قبلہ درست کیا جائے اور اس کی اصلاح کی جائے۔ اس اصلاح کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اسلامی اصولوں پر عصری ضروریات کی روشنی میں عمل کرتے ہوئے تعلیم کی مغربیت (Westernization) کو ردّ کر دیا جائے۔ اس غرض سے جو کام اہمیت کے حامل ہیں وہ یہ ہیں کہ تعلیم سے ثنویت (dichotomy) یعنی دین و دنیا کی تفریق ختم کی جائے، یعنی دینی مدارس میں جدید علوم کا تعارفی مطالعہ کرایا جائے اور جدید تعلیم کے اداروں میں مذہبی تعلیم و تربیت کا مؤثر انتظام کیا جائے۔ طلبہ کی تعمیر سیرت و کردار اور تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ خواتین کی تعلیم کا خصوصی انتظام کیا جائے اور ان کے لیے الگ نصاب بنایا جائے۔ معیار تعلیم بلند کیا جائے اور نصاب سازی، تربیت اساتذہ اور ہم نصابی سرگرمیوں کا کام اسلامی تناظر میں کیا جائے اور مغربیت (ویسٹرنائزیشن) اور اس کی اقدار کو رد کیا جائے جیسے تعلیم کی کمرشلائزیشن، مخلوط تعلیم، غیر مسلم اور غیر پاکستانی مصنفین کی نصابی کتب، غیر ملکی امتحانات (او اور اے لیول)، انگریزی زبان کا غلبہ (انگلش میڈیم اور پہلی جماعت سے لازمی انگریزی وغیرہ) اور مغربی کلچر پر مبنی ہم نصابی سرگرمیاں (جیسے غیر ملکی یونیفارم، مخلوط پکنک، ڈرامے، کنسرٹ وغیرہ)۔

یہ سارے کام کون کرے؟ جب حکومت کی اس طرف توجہ نہیں تو لامحالہ یہ کام پرائیویٹ سیکٹر اور سول سوسائٹی کو کرنا ہوں گے اور اس کے لیے ایسے موزوں نگران ادارے قائم کرنے ہوں گے جو موجودہ تعلیمی اداروں (سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور دینی مدارس) کی نہ صرف مذکورہ تناظر میں اصلاح کریں بلکہ اصلاح یافتہ نئے تعلیمی ادارے قائم کریں۔ ایسے نگران ادارے سول سوسائٹی کے تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے افراد بھی قائم کر سکتے ہیں اور خود اصلاح کے خواہاں تعلیمی ادارے بھی باہم نیٹ ورکنگ کر کے ایسے نگران ادارے قائم کر سکتے ہیں۔ یہ نکات جن کی طرف ہم نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے ان کی تفصیل اور وضاحت کے لیے ہم کئی کتب مرتب کر چکے ہیں۔

۲۔ میڈیا

پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا ہمارے زمانے میں لوگوں کی ذہن سازی میں اہم کردار ادا کر رہا ہے لیکن بدقسمتی سے تعلیم کی طرح اس کا قبلہ بھی درست نہیں ہے اور مغرب کی سازش اور پیروی سے لامحدود آزادی کا ایک ایسا غلط تصور ہمارے معاشرے میں آ گیا ہے جو اہل مغرب کے نزدیک تو صحیح ہے لیکن اسلامی روایت کے سراسر خلاف ہے کیونکہ اسلام کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ عبد ہونے کی حیثیت سے انسان اللہ تعالیٰ کی غیر مشروط عبادت و اطاعت کرے لہٰذا مسلم معاشرے میں آزادی اسلامی تعلیمات سے محدود

ہوتی ہے لیکن ہمارا میڈیا مغرب سے مرعوب و متاثر ہونے کی وجہ سے جو چاہتا ہے دکھاتا ہے اور جیسے پروگرام چاہتا ہے پیش کرتا ہے چنانچہ تفریح کے نام پر فحاشی و عریانی اور رقص و سرود پیش کیا جاتا ہے اور حالات حاضرہ کے نام پر پاکستان اور اس کے نظریے کے بخیے ادھیڑے جاتے ہیں لیکن حکومت ٹس سے مس نہیں ہوتی اور رائے عامہ بھی غیر منظم اور بے حس ہے اور کوئی ردعمل نہیں دیتی اور نہ علماء کرام اور دینی جماعتیں حرکت میں آتی ہیں جب کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ نہ صرف یہ کہ سلبی طور پر کسی حکومتی یا پرائیویٹ چینل سے کوئی ایسا پروگرام پیش نہ کیا جائے جو اسلامی اصول و اقدار کے خلاف ہو یا پاکستان کے مفادات اور اس کے نظریے کے خلاف ہو بلکہ مثبت انداز میں ایسے پروگرام بھی تیار اور پیش کیے جانے چاہئیں جو معاشرے میں اسلامی اصول و اقدار کو پروموٹ کریں اور لوگوں میں اسلامی زندگی گزارنے کا داعیہ پیدا کریں اور اس معاملے میں ان کی رہنمائی کریں اور ان کو ترغیب دیں لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کام کون کرے؟ ہم کہتے ہیں کہ سول سوسائٹی کے دین دار افراد کریں جن میں میڈیا میں کام کرنے والے اور میڈیا سے دلچسپی رکھنے والے افراد سرفہرست ہوں۔ حکومت سے ایک ثقافتی پالیسی بنوائی جائے۔ وہ نہ بنائے تو خود ایک ثقافتی پالیسی بنائی جائے اور اسے رواج دیا جائے۔ صحافیوں کی پیشہ وارانہ اور نظریاتی تربیت کے ادارے بنائے جائیں۔ میڈیا پر چیک رکھنے کے لیے نگران کمیٹیاں بنائی جائیں۔ غیر تعمیری اور غیر اسلامی پروگرام پیش کرنے والے میڈیا مالکان سے مل کر احتجاج کیا جائے اور ضرورت ہو تو ان کے خلاف ریلیاں اور جلوس نکالے جائیں اور ان کو عدالتوں میں گھسیٹا جائے۔ رائے عامہ کی قوت سے ایک پریس کورٹ بنائی اور چلائی جائے۔ اسلامی تناظر میں تعمیری اور تفریحی پروگرام بنانے اور پیش کرنے کے لیے ادارے بنائے جائیں اور ایسے ٹی وی چینلز کھولنے کی کوشش کی جائے جو اسلام کو فرقہ واریت سے بالاتر ہو کر اور عصری تقاضوں کے مطابق اسلامی تعلیمات کو سلیقے اور حکمت سے پیش کریں۔

۳۔ تعمیر اخلاق

قوموں کے عروج و زوال کا انحصار ان کی اخلاقی حالت پر ہوتا ہے۔ اخلاق بنتے اور بگڑتے ہیں نظام تعلیم و تربیت سے اور ذرائع ابلاغ سے۔ اسلام جس قسم کے اخلاق کی تعمیر چاہتا ہے ضروری ہے کہ ہم اس کے لیے موزوں نظام تعلیم و تربیت اور موزوں نظام ابلاغ وضع کریں۔ تعلیم اور میڈیا کے ذریعے یہ کام کیسے اور کس طرح ہو سکتا ہے اس کی کچھ تفصیلات ہم نے سطور سابقہ میں ذکر کی ہیں جن سے مقصود یہ تھا کہ تعلیمی اداروں اور میڈیا کو تعمیر اخلاق میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ یہاں ہم مزید یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ سماجی اور معاشرتی سطح پر یعنی گھروں میں، خاندانوں میں اور گلی محلے اور کمیونٹی کی سطح پر بھی ہمیں تعمیر و اصلاح اخلاق کا کام کرنا چاہیے۔ مطلب یہ کہ اولاً ہمارے تعلیمی ادارے ایسے ہونے چاہئیں اور ہمارا

میڈیا ایسا ہونا چاہیے جو بچوں میں اسلامی اخلاق پیدا کرے اور ثانیاً ہمارا معاشرتی ماحول بھی ایسا ہونا چاہیے جو تعلیمی ادارے اور میڈیا کے اس مثبت کردار کا مؤید ہو، جو اسے پختہ تر کرے نہ کہ وہ اس کی مزاحمت کرنے والا اور اس کے اثرات زائل کرنے والا ہو، جیسا کہ بدقسمتی سے اِس وقت وہ ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ گلی محلے کے لوگ اس کے لیے ذہنی طور پر بیدار (conscious) ہوں تا کہ اپنی اخلاقی اقدار کی حفاظت کر سکیں مثلاً لڑکے بالے گلی کی نکڑ یا بازار کے کونے پر کھڑے ہو کر فضول ہنسی مذاق نہ کریں یا راہ چلتی خواتین کو تنگ نہ کریں۔ پارکوں میں بیٹھ کر سگریٹ نہ پئیں اور نشہ نہ کریں۔ محلے میں کوئی لائبریری قائم کر دی جائے، کھیلوں کو منظم کر دیا جائے۔ مختلف مواقع (مثلاً یوم پاکستان، یوم اقبال، استقبالِ رمضان وغیرہ) پر تقریبات منعقد کی جائیں۔ پڑھائی میں کمزور طلبہ کی مدد کی جائے۔ کسی بوڑھی اور معذور بیوہ کی مدد کی جائے۔ کسی مریض کو ہسپتال لے جایا جائے۔ کسی بے روزگار کو ملازمت دلوانے کی سعی کی جائے۔ مسجد یا کسی گھر میں ترجمۂ قرآن کی کلاس شروع کر دی جائے۔ محلے والے کھاتے پیتے ہوں تو سکول قائم کر لیا جائے۔ ڈسپنسری کھول لی جائے۔ محلے میں نیٹ کیفے، وڈیو شاپ یا ریسٹورنٹ کا غلط استعمال ہو رہا ہو تو اسے روکا جائے۔ غرض خدمت خلق اور تعمیری مصروفیت کے سو کام نکالے جا سکتے ہیں۔

یہ تین کام جن کا ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ایسے ہیں جن سے معاشرے کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اصلاح کا یہ کام حکومت بھی کر سکتی ہے اور اصلاً اسے ہی کرنا چاہیے لیکن جب حکومت کو اس کا احساس نہیں (اور وہ خود اصلاح طلب ہے) اور ان کاموں کے بغیر معاشرے کی اصلاح اور تعمیر ممکن نہیں تو پھر رائے عامہ کو بیدار ہو کر یہ کام خود کرنے چاہئیں۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ سول سوسائٹی کے مختلف طبقات کے وہ افراد جنھیں اپنے نظریۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی اہمیت کا احساس ہے، ان کا فرض ہے کہ وہ متحد و متحرک ہوں اور تعلیم، میڈیا اور تعمیر اخلاق کے لیے منظم کوششوں کا آغاز کریں۔

مسائل ومشکلات کا حل بذریعہ خدمت خلق

لیکن جس معاشرے میں ہم زندہ ہیں، صرف اصلاحی کوششیں یہاں کارگر نہیں ہو سکتیں کیونکہ حکمرانوں کی عدم توجہ سے معاشرہ مشکلات ومسائل کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ لوگ دکھوں اور تکلیفوں میں گھرے ہوئے ہیں اور کوئی ان کا پشتیبان نہیں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ لوگوں کے دکھ درد کم کرنے کے لیے بھرپور کوششیں کی جائیں اور اس کے لیے خدمت خلق کی بھرپور تحریک چلائی جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دین مسلمانوں کے باہم ہمدردی اور خیر خواہی کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غریبوں کی مدد، مسکینوں کی اعانت اور کمزوروں کی حمایت تمام عمر آپؐ کا اسوۂ حسنہ رہا اور صحابہ کرامؓ نے بھی آپؐ سے یہی سبق سیکھا اور وہ ہمیشہ مظلوموں اور معاشرے کے پسے ہوئے طبقات وافراد کی مدد کرنے پر کمربستہ رہتے تھے۔ چنانچہ خدمت خلق جزو دین اور منشائے شریعت ہے بلکہ شریعت کا بنیادی مقصد ہی لوگوں کے مصالح کا تحفظ ہے۔ اسی لیے ماہرین اصول فقہ اس بات پر متفق ہیں کہ شریعت کے

پانچ بڑے مقاصد ہیں: حفظ دین، حفظ جان، حفظ نسل، حفظ عقل اور حفظ مال۔ شریعت کے احکام انہی پانچ مقاصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے نازل کیے ہیں اور ان کے بغیر شریعت کے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے لہٰذا ان مقاصد کے لیے کام کرنا دین کے لیے کام کرنا ہے۔ یہی نفاذِ شریعت ہے اور ان مقاصد کے لیے کام کرنا ہی ہر مسلم ریاست وحکومت کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ اور اگر حکومت یہ کام نہ کرے تو جتنے کام بغیر ریاستی قوت کے ہو سکتے ہوں وہ مسلم عوام کو منظم ومجتمع ہو کر کرنے چاہئیں اور شرعی لحاظ سے یہ قطعاً غلط اور ناقابل قبول ہے کہ اگر مسلم حکومت اِن مقاصد کے لیے کام نہ کرے تو علماء، خاندانوں اور اداروں کے سربراہ اور ذمہ داران بھی یہ کام نہ کریں بلکہ انہیں اِن مقاصد کے لیے ضرور جدوجہد کرنی چاہیے اور آج کل کے حالات ایسے ہیں کہ اگر سول سوسائٹی پرائیویٹ سیکٹر میں اِن مقاصد کے لیے منظم اور متحرک ہو کر محنت کرے تو شریعت بڑی حد تک نافذ ہو جائے گی اور کوئی اس کا راستہ نہیں روک سکے گا۔ لہٰذا جو لوگ دین اور شریعت کو صرف نماز روزے تک محدود رکھتے ہیں اور مقدرت رکھتے ہوئے مذکورہ پانچ مقاصد شرعیہ کے حصول کے لیے کام نہیں کرتے اور دوسرے لفظوں میں مسلمانوں کے دکھ درد میں شریک نہیں ہوتے اور ان کے مسائل ومشکلات حل کرنے کے لیے کوششیں نہیں کرتے، ہماری رائے میں وہ غلط ہیں اور انہیں اپنے فہم دین کی اصلاح کرنی چاہیے۔ خلاصہ یہ کہ دینی تعلیمات کا تقاضا یہ ہے کہ کمزور اور غریب ومحتاج مسلمانوں کی مدد کی جائے۔ خدمتِ خلق کے اس کام کے بیسوں شعبے ہو سکتے ہیں اور سب میں کام ہونا چاہیے لیکن بطور نمونہ ہم نے ان میں سے تین کاموں کا انتخاب کیا ہے:

۱۔ مفلسی دور کرنے کے اقدامات

اِس مقصد کے لیے کئی طرح سے کام کیا جا سکتا ہے مثلاً ہر محلے یا گاؤں کی سطح پر ایک کمیٹی بنالی جائے جو وہاں کے کھاتے پیتے گھروں سے کچھ معمولی رقم ماہانہ اکٹھی کرے اور محلے یا بستی کے یتیموں، بیواؤں اور مسکینوں کو ہر ماہ راشن مہیا کرے تاکہ کوئی مسلمان بھوکا نہ مرے اور اس کی بنیادی ضروریات زندگی پوری ہوتی رہیں۔ یہ بات بظاہر معمولی لگتی ہے لیکن اگر یہ کام ہر محلے یا بستی کی سطح تک منظم ہو جائے تو معاشرے میں انقلاب برپا ہو جائے گا۔ اسی طرح ملک میں ایک مرکزی زکوٰۃ کونسل قائم کی جا سکتی ہے اور اگر اس کے چلانے والے ایسے لوگ ہوں جن پر قوم اعتماد کرتی ہو تو اس کونسل میں زکوٰۃ وصدقات کے کروڑوں روپے جمع ہو سکتے ہیں اور ایک نظم اور حکمت کے ساتھ ان سے معاشرے کے پسے ہوئے طبقات کی مدد کی جا سکتی ہے۔ ہر آبادی میں بلا معاوضہ کھانے کے تنور یا ہوٹل قائم کیے جا سکتے ہیں۔ کھاتے پیتے گھرانوں سے کپڑے اکٹھے کر کے غریبوں تک پہنچانے کے سٹور قائم کیے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح غریب بچوں کی فیسیں ادا کرنے کا انتظام کیا جا سکتا ہے، غریبوں کے علاج کے لیے فری ڈسپنسریاں قائم کی جا سکتی ہیں اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے کام کیے جا سکتے ہیں، ضرورت صرف احساس، جذبے، تحرک اور تنظیم کی ہے۔

۲۔ بحالیٔ امن وامان

ہمارے معاشرے میں لوگوں کا امن وسکون غارت ہو چکا ہے۔ روز چوریاں ہوتی اور ڈاکے پڑتے ہیں۔ اب تو سٹریٹ کرائمز بھی خاصے بڑھ گئے ہیں اور لفنگے وبدقماش نوجوان راہ چلتی خواتین کے پرس اور مردوں سے موبائل فون اور نقدی وغیرہ چھین لیتے ہیں۔ امن وامان کی بحالی حکومت کی ذمہ داری ہے لیکن اگر حکومت یہ کام نہ کرے تو کیا عوام کا یہی کام ہے کہ وہ لٹتے رہیں اور بے بسی سے دیکھتے رہیں۔ اگر وہ منظم ہو جائیں تو موجودہ صورت حال پر خاطر خواہ حد تک قابو پایا جاسکتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ہر گلی میں ایک 'امن کمیٹی' بنالی جائے اور گلی کے نوجوان رات کو باری باری جاگ کر پہرہ دیا کریں۔ اس سے کسی ایک فرد پر بوجھ بھی نہیں پڑے گا اور چوریوں سے جان بھی چھوٹ جائے گی۔

اس امن کمیٹی کے ارکان (بوڑھے اور جوان) اگر دن میں بھی آتے جاتے (خصوصاً نماز کے لیے مسجد میں آتے جاتے) اگر گلی میں آنے جانے والوں پر نظر رکھیں تو سٹریٹ کرائمز بھی ختم ہو جائیں گے اور چوروں اچکوں کو پتہ چل جائے گا کہ گلی محلے والے منظم ہیں تو وہ بھی ادھر آنے سے کترائیں گے۔

گلی والوں میں اتفاق ہو جائے تو وہ ماہانہ رقم اکٹھی کر کے گلی میں چوکیدار بھی رکھ سکتے ہیں۔ اور چونکہ اتفاق میں برکت ہوتی ہے اس لیے زیادہ پیسے بھی نہیں دینے پڑیں گے۔ دو چار سو روپے ماہانہ دینے سے امن وسکون کا جو احساس پیدا ہوگا اس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ ہمارے ہاں ابھی لوگوں کو اجتماعی سماجی کاموں کے لیے منظم ہونے کا تجربہ اور تربیت نہیں ہے۔ اگر گلی کا کوئی ایک سمجھدار اور سنجیدہ آدمی اس کام کی اہمیت کو سمجھ کر اس کے لیے متحرک ہو جائے اور ذرا صبر وحکمت سے کام لے تو لوگ آہستہ آہستہ سیکھنے لگیں گے اور ان کی بتدریج تربیت ہوتی رہے گی۔ تجربہ شرط ہے۔

۳۔ فراہمیٔ عدل وانصاف

ہمارے ملک کا نظام انصاف ناکارہ ہو چکا ہے خصوصاً نچلی عدالتوں میں رشوت اور سفارش کا بازار گرم ہے اور انصاف کا پراسیس اتنا طول کھینچتا ہے خصوصاً دیوانی عدالتوں میں کہ آدمی کی عمر بیت جاتی ہے لیکن فیصلہ نہیں ہو پاتا اور ہو جائے تو مبنی بر انصاف اور اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں ہوتا۔ ہر عدالت میں مقدمات کی اتنی بھرمار ہوتی ہے کہ لوگوں کی باری نہیں آتی اور نہ جج کسی ایک مقدمے کو اتنا وقت دے سکتا ہے کہ مقدمات کا جلد فیصلہ ہونے لگے۔ حکومتی سطح پر اس صورت حال کی اصلاح کے لیے اقدامات کیے جانے ناگزیر ہیں لیکن جب تک حکومت نظام انصاف کی اصلاح نہیں کرتی کیا مظلوم عوام اسی طرح پستے رہیں؟

ہمارے نزدیک اس کا ایک معقول حل یہ ہے کہ ہر محلے اور بستی کی سطح پر شرعی/مصالحتی عدالتیں قائم کی جائیں۔ چونکہ پاکستانی قوانین میں عدالت سے باہر مصالحت اور ثالثی کی گنجائش موجود ہے لہٰذا اگر

سول سوسائٹی کے عدل پسند عناصر متحد و متحرک ہو جائیں تو ہر محلے و بستی کی سطح پر شرعی/مصالحتی عدالتوں کا نیٹ ورک قائم کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی اصولوں کی پاسداری کے لیے یہ اہتمام کیا جا سکتا ہے کہ اس مجوزہ تین رکنی عدالت کا سربراہ کوئی تعلیم یافتہ عالم دین ہو اور دیگر دو ارکان ریٹائرڈ جج، وکیل، پروفیسر، استاد، ریٹائرڈ سرکاری ملازم یا علاقے کے معزز، متدین اور غیر جانبدار افراد میں سے ہو سکتے ہیں۔ مخصوص سیاسی مفادات کے علمبردار سیاستدانوں اور شدید فرقہ وارانہ رجحانات رکھنے والے علماء سے گریز کیا جائے تاکہ انصاف کے تقاضے پامال نہ ہوں۔

اس طرح کی مصالحتی عدالتیں جنہیں ہم نے اس حکمت کے تحت شرعی عدالتیں کہا ہے کہ لوگ ان کی طرف رجوع کرنے میں آسانی محسوس کریں۔ اگر ان میں فیصلے شریعت کے مطابق ہوں اور پورے پراسیس کو ایک نوع کا تقدس حاصل ہو جائے تو یہ عدالتیں بہت جلد ملک بھر میں پاپولر ہو جائیں گی اور لوگوں کو عدالتوں سے باہر شریعت کے مطابق انصاف ملنے کی امید بندھ جائے گی۔ وکیلوں اور عدالتوں کے اخراجات سے ان کی جان چھوٹے گی اور چونکہ یہ عدالتیں مقامی ہوں گی لہٰذا سفر کی مشقت اور اخراجات سے بھی جان چھوٹے گی اور فیصلے بھی جلد ہوں گے۔ قصبات اور شہروں میں ان عدالتوں کے اوپر ایک نگران یا اپیل کورٹ بھی قائم کی جا سکتی ہے۔

ہماری سوچی سمجھی رائے ہے کہ یہ اسکیم قابل عمل ہے۔ ضرورت صرف جذبے اور تنظیم کی ہے۔ اگر رائے عامہ بیدار ہو جائے اور سول سوسائٹی کے مختلف طبقات کے سربرآوردہ لوگ اس کے لیے منظم و متحرک ہو جائیں تو اس طرح کی عدالتوں کا ملک بھر میں جال پھیلایا جا سکتا ہے۔

حاصل بحث

ہماری اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ پاکستانی معاشرے میں سماجی تبدیلی کے لیے اسلامی تناظر میں اصلاح و خدمت کی ایک طاقتور تحریک اٹھنی چاہیے۔ یہ تحریک غیر سیاسی اور غیر مسلکی ہونی چاہیے تاکہ اس میں ہر فرد شریک ہو سکے۔ عمر، تعلیم، جنس، معاشی یا معاشرتی حیثیت اور پیشے وغیرہ کی بھی کوئی تخصیص یا شرط نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ہمارا معاشرہ ہے، اس میں ہم نے رہنا ہے تو ہمیں ہی اسے رہنے کے قابل بنانا ہے۔

ہم نے اس تحریر کی ابتداء میں سیاستدانوں اور دینی عناصر کی بحیثیت ایک طبقہ ناکامی اور غیر موثر ہونے کا ذکر کیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان میں اچھے لوگ نہیں ہیں یا انہیں اس تحریک میں شامل نہیں ہونا چاہیے بلکہ دیکھا جائے تو سیاستدان اور علماء کرام ہمارے معاشرے اور سول سوسائٹی کا اہم حصہ ہیں لہٰذا انہیں تو اس تحریک میں ضرور شریک ہونا چاہیے اور اس کی قیادت بھی کرنی چاہیے۔ بحیثیت طبقہ ان کی ناکامی کا ذکر کرنے کا مطلب یہ تھا کہ چونکہ وہ بحیثیت طبقہ نتائج نہیں دے سکے لہٰذا سول سوسائٹی کو خود متحرک ہو کر معاشرے کے معاملات اپنے ہاتھ میں لینے چاہئیں اور صرف ان پر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔

آپ کیا کر سکتے ہیں؟

ہم نے اس تحریر میں سماجی تبدیلی کی تحریک کے لیے چھ بڑے دائرہ ہائے کار تجویز کیے ہیں جن میں کافی وسعت اور تنوع ہے اور آپ ان میں سے کسی ایک میں بھی کام کر سکتے ہیں۔ اٹھیے اور اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیجیے! کم از کم اس پیغام ہی کو آگے کسی اور تک پہنچا دیجیے- کسی استفسار یا وضاحت کے لیے بلا تکلف ہم سے رابطہ کیجیے:

تحریک اصلاح تعلیم

A-71 فیصل ٹاؤن، لاہور

فون: 0300- 4609522

ای میل ermpak@hotmail.com

برائے SMS: 0300-4354673

ملاقات کے لیے وقت طے کر کے تشریف لائیں

ہمارا دینی تناظر

ڈاکٹر محمود احمد غازی

زوالِ امت میں علماء کا کردار

مسلم امت زوال پذیر کیوں ہوگئی؟ اس کے اسباب کیا تھے؟ یہ ایک انتہائی سنجیدہ تحقیق کا موضوع ہے اور یہ اس لیے بہت اہم ہے کہ اس سے جڑا ہوا اگلا موضوع یا سوال یہ ہے کہ امت اس زوال سے کیسے نکلے؟ منطقی بات یہ ہے کہ جب تک ہم پہلے سوال کا جواب نہ دیں، دوسرے سوال کا جواب ہم پر واضح نہیں ہو سکتا۔

اہل فکر و نظر ان دونوں سوالوں پر غور کر کے اپنے نتائج فکر سامنے لاتے رہے ہیں۔ اس نشست میں ہم پاکستان کے معروف اسلامی سکالر اور دانشور مرحوم ڈاکٹر محمود احمد غازی کے رشحات فکر سامنے لا رہے ہیں جنہوں نے اپنے ایک خطبے میں ضمناً اسباب زوال کے حوالے سے علماء کرام کے کردار کا ذکر کیا ہے☆۔ یہ خود احتسابی علماء کرام پر گراں نہیں گزرنی چاہیے کیونکہ اس خود احتسابی ہی سے وہ رویے تشکیل پا سکتے ہیں جو امت کے سنہرے مستقبل کی ضمانت بن سکتے ہیں۔

اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ ہمیں بھی اس موضوع کے بعض پہلوؤں پر غور کی سعادت حاصل ہوئی ہے اور ہماری ۵۰۰ صفحات کی کتاب ’مسلم نشاۃ ثانیہ- اساس اور لائحہ عمل‘ کے عنوان سے مکتبہ البرہان سے دستیاب ہے۔[مدیر]

چودھویں صدی ہجری کے آغاز سے لے کر آج تک کا عرصہ دنیائے اسلام میں ایک شدید ذہنی

کشمکش اور سیاسی افراتفری کا دور ہے۔ اس طویل مدت میں وہ معرکہ کہن دوبارہ جاری ہوا، اور دوبارہ زندہ ہوا، جو ماضی میں تاتاریوں کے حملہ اور زوال بغداد کے بعد دیکھنے میں آیا تھا۔ چودہویں صدی ہجری کا جب آغاز ہوا تو دنیائے اسلام مغرب سے مشرق تک شدید مصائب اور مشکلات کا شکار تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ عرصہ دنیائے اسلام کے لیے انتہائی مشکلات کا عرصہ سمجھا جاتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ دنیاوی زوال کے اعتبار سے، سیاسی کمزوری، عسکری ناکامی اور اقتصادی بدحالی کے نکتۂ نظر سے چودہویں صدی ہجری کے آغاز کا زمانہ دنیائے اسلام کے لیے انتہائی پریشان کن دور تھا۔ مغربی طاقتیں ایک ایک کر کے مختلف اسلامی ممالک پر قابض ہوچکی تھیں۔ دنیائے اسلام کا بیشتر حصہ براہ راست مغرب کے عسکری قبضے کا شکار تھا۔ آزاد مسلم ممالک برائے نام تھے۔ بعض چھوٹی چھوٹی ریاستیں اس لیے مقامی طور پر آزاد سمجھی جاتی تھی

☆ 'محاضرات شریعت' کے گیارہویں خطبے کا ابتدائی حصہ۔ عناوین البتہ ہمارے ہیں۔

کہ یا تو مختلف مغربی طاقتوں کا مفاد اس میں تھا کہ ان علاقوں کو داخلی طور پر آزاد رہنے دیا جائے، مختلف مغربی طاقتوں کی آپس میں کشمکش نے وقتی طور پر بعض حکمرانوں کو آزاد ریاست کی حیثیت سے حکمرانی کا موقع دے دیا تھا۔ اُس زمانے میں دنیائے اسلام کی سب سے بڑی سلطنت یعنی سلطنت عثمانیہ تیزی سے زوال کا شکار تھی۔ اس کو یورپ کا مرد بیمار قرار دیا جاتا تھا۔ اس کے یورپی مقبوضات ایک ایک کر کے اس کے ہاتھ سے نکل رہے تھے۔ یورپ کی تمام بڑی طاقتوں نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف اتحاد کر رکھا تھا۔ نہ صرف اتحاد کر رکھا تھا بلکہ اس امر پر بھی اتفاقِ رائے کر رکھا تھا کہ سلطنت عثمانیہ کے زوال کے بعد اس کے کون کون سے مقبوضات کن کن مغربی طاقتوں کے حصے میں آئیں گے۔

دوسری طرف وہ استعماری تحریک جس کا آغاز کم وبیش ڈیڑھ دو سو سال پہلے ہو چکا تھا، دنیائے اسلام پر پوری طرح متمکن ہوچکی تھی۔ استعمار کے پنجۂ استبداد میں پوری دنیائے اسلام کراہ رہی تھی، دنیائے اسلام کے وسائل مغربی دنیا کی معاشی ترقی کے لیے استعمال ہو رہے تھے، دنیائے اسلام کی حیثیت مغربی ممالک کی پیداوار کے لیے ایک مارکیٹ اور بازار سے زیادہ نہ تھی۔

زوال کی ابتداء

یہ زوال جس کے مظاہر زندگی کے ہر گوشے میں نظر آ رہے تھے۔ کب سے شروع ہوا؟ اور اس کے اسباب کیا تھے؟ اسلامی تاریخ پر اگر غور کیا جائے، خاص طور پر شریعت کے نفاذ کے سیاق وسباق میں اگر دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ زوال دسویں صدی ہجری کے بعد شروع ہوا اور وقت کے ساتھ ساتھ

بڑھتا چلا گیا۔ دسویں صدی ہجری تک کا زمانہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی شریعت پر عملدرآمد اور اسلامی تہذیب کے عروج کا زمانہ ہے۔ ایک ہزار سال کا یہ دور دنیائے اسلام کی قیادت کا دور ہے۔ فکری قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، تہذیبی رہنمائی کا پرچم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے اور تھوڑی بہت علاقائی کمزوریوں کے باوجود جن کے مظاہرے جابجا دیکھنے میں آتے رہتے تھے، بحیثیت مجموعی دنیائے اسلام کا رُخ عروج کی طرف تھا اور مسلمانوں کی قوت اور سیاسی بالادستی کا اعتراف و احساس پوری دنیا میں عام تھا۔ تجارت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اور سکہ رائج الوقت جس کو مسلمان اپنے فکری اور تہذیبی دارالضرب میں ڈھالتے تھے، دنیا کے بازاروں میں چلتا تھا۔ فکری، علمی، تصنیفی اور تالیفی میدان میں مسلمانوں کی امامت کو دنیا کے بیشتر ممالک، تہذیبیں اور حکمران طبقے سب تسلیم کررہے تھے۔

دسویں صدی ہجری کے بعد سے مسلمانوں میں فکری زوال کا عمل شروع ہوا۔ پہلے مرحلہ میں فکر و تہذیب میں ایک ٹھہراؤ کی کیفیت محسوس ہوئی، یہ ٹھہراؤ وہ تھا جس میں دنیائے اسلام کی فکری ترقی رک چکی تھی اور جو کچھ حاصل ہو چکا تھا، اب اسی کے درس و تدریس، اسی کے پڑھنے پڑھانے میں بیشتر مسلمان اہل علم لگے رہے۔ عقلیات کے میدان میں جو کچھ یونانیوں نے سکھایا تھا، اب محض اسی کو دہرانے پر اکتفا کیا جانے لگا اور اسی کو نئے نئے انداز اور نئے نئے اسالیب میں بیان کرنا عقلیات کی معراج سمجھا جاتا تھا۔ دینی علوم، تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ کے میدانوں میں جو کام ساتویں آٹھویں صدی تک ہو گیا تھا اس میں کوئی قابل ذکر پیش رفت چند اکا دکا استثنائی مثالوں کے علاوہ نظر نہیں آتی تھی۔ برصغیر کے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ایک استثناء ہیں۔ شیخ احمد سرہندی ایک استثناء ہیں۔ اسی طرح سے دنیائے عرب میں، دنیائے عجم میں بعض بہت نمایاں شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ عقلیات کے میدان میں ملا صدرا ایک استثناء کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان استثنائی مثالوں کے علاوہ، جن کی تعداد بہت کم ہے، دنیائے اسلام میں جو عمومی رجحان پایا جاتا تھا، وہ ایک ٹھہراؤ کا رجحان تھا جس میں اس بات کی نشان دہی واضح طور پر موجود تھی کہ فکری ترقی اور علمی ارتقاء کا یہ عمل اب رک گیا ہے۔ اور بہت جلد یہ پانی اسٹگنیشن کا شکار ہو جائے گا۔ اس پانی میں سڑاھند پیدا ہو جائے گی اور اس کا بہاؤ چونکہ رک گیا ہے اس لیے اب یہ زندگی کا وہ ماخذ اور مصدر نہیں بن سکے گا، جس طرح سے ماضی میں رہا تھا۔

تقلید کا رجحان

یہی وہ زمانہ تھا جب تقلید کا رویہ دنیائے اسلام میں بہت مضبوط ہوا۔ تقلید کو سمجھنے میں متاخر اہل علم سے بعض تسامحات ہوئے ہیں۔ تقلید کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ شریعت کے کسی حکم یا کسی اجتہاد یا کسی فتوے

کے ضمن میں ایک غیر فقیہ اور غیر مجتہد کسی مجتہد کی رائے پر اس لیے عمل کرے کہ وہ خود اجتہاد کا عمل انجام نہیں دے سکتا۔ اس لیے جس شخص کے علم اور تقویٰ پر اس کو اعتماد ہے اس اعتماد کی وجہ سے اس کی بات کو بغیر دلیل کے قبول کر لیا جائے۔ اس حد تک تقلید کا عمل مسلمانوں میں پہلے دن سے رہا ہے۔ صحابہ کرام میں ہر شخص مجتہد نہیں تھا۔ صحابہ کرام کی بڑی تعداد دوسرے اہل علم کے اجتہاد اور فتویٰ پر عمل کیا کرتی تھی۔ تابعین میں بڑی تعداد دوسرے اہل علم تابعین کے اجتہاد اور فتویٰ پر عمل کیا کرتی تھی۔ اس لیے خالص شریعت اور فقہ کے معاملات میں، قرآن پاک اور سنت کے فہم کے معاملے میں ان حدود کے مطابق اور اس حد تک تو تقلید روزِ اوّل سے رہی ہے لیکن جس کو میں یہاں اس گفتگو کے سیاق و سباق میں تقلید کہہ رہا ہوں، اس سے مراد یہ ہے کہ ہر علم وفن کے متعلق مؤلف کی بات بغیر کسی تنقید و تحقیق کے قبول کر لی جائے اور اس بات کے مبنی بر حق ہونے کے لیے یہ دلیل کافی سمجھی جائے کہ ہم سے پہلے فلاں لکھنے والے نے اس طرح لکھ دیا ہے، چاہے اس کا علم اور عقل، اس کا دین اور تقویٰ بھروسے کے قابل ہو یا نہ ہو۔

جب تقلید اور علمی تابعداری کا یہ مزاج پیدا ہو گیا تو یہ مزاج عقلیات میں بھی پیدا ہوا، خالص تجرباتی میں بھی سامنے آیا، علوم وفنون کے ہر شعبے میں سامنے آیا۔ چنانچہ عقلیات میں یونانیوں کی تقلید شروع ہو گئی۔ کسی بات کے مبنی بر عقل اور قابل قبول ہونے کے لیے یہ کافی تھا کہ ارسطو نے کہا ہے یا افلاطون نے کہا ہے، یا فلاں یونانی حکیم نے کہا ہے۔ حتیٰ کہ طب جیسے خالص تجرباتی علم میں بھی جس کا تعلق انسان کے اپنے مشاہدے اور تجربے سے ہے۔ جس کا تجربہ علاقے کے بدلنے سے بدل سکتا ہے، موسم کے بدلنے سے بدل سکتا ہے، افراد کے بدلنے سے بدل سکتا ہے۔ وہاں ایک تصور کو محض اس لیے قبول کر لینا کہ ارسطو نے کہا ہے یا جالینوس نے کہا ہے کوئی قابل فخر علمی طرزِ فکر نہ تھا۔ جب ایسا ہوا تو اس سے علم طب کی ترقی پر اثر پڑا۔

یہی کچھ عقلیات کے میدان میں ہوا۔ یونانیوں کی بے شمار خرافات، اوہام اور فضولیات کو بہت سے اہل علم نے صرف اس لیے قبول کر لیا کہ وہ یونانیوں سے منسوب تھے۔ یہی حال بقیہ لوگوں کے ساتھ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مسلمان منطقی، جو اپنے آزادانہ عقلی معیار اور استدلال کے ساتھ منطق کے معاملے میں حاکم بن کر بیٹھتا تھا کہ منطق میں کیا بات قابل قبول ہے اور کیا بات ناقابل قبول ہے، مفقود ہو گیا۔ جو آزادانہ رویہ امام غزالیؒ، امام رازیؒ اور امام ابن تیمیہؒ کا تھا وہ ختم ہو گیا۔ اب یہ بات کافی تھی کہ فلاں نے لکھ دی ہے۔ یہ بات عقلیات میں بھی سامنے آئی۔ جب ایسا ہو جائے تو پھر فکر کی ترقی رک جاتی ہے اور زوال کا آغاز شروع ہو جاتا ہے۔

مغربی تہذیب کا عروج

دسویں گیارہویں صدی ہجری تک یہ رویہ اور انداز مسلمانوں میں عام ہوگیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیائے مغرب میں تبدیلی کی ایک طاقت ور اور نئی روجنم لے رہی تھی۔ مذہب وثقافت میں بڑی بڑی تبدیلیاں سامنے آرہی تھیں، علوم وفنون پر نئے انداز سے غور کیا جارہا تھا، صنعتی انقلاب رونما ہورہا تھا، سائنس اور تجربی علوم کے نئے نئے گوشے سامنے آرہے تھے، پوری دنیا میں ان کی تجارت پھیل رہی تھی، بحری طاقت پھر مغربی ہاتھوں میں منتقل ہورہی تھی، پرتگال اور اسپین کے بحری بیڑے دنیا کے گوشے گوشے کا جائزہ لے رہے تھے، یورپ کے محققین دنیا کے چپے چپے پر تحقیق کررہے تھے۔ ظاہر ہے تحقیق کا عمل تقلید کے نتیجے میں قائم نہیں ہوسکتا۔ تحقیق اور تقلید دونوں متعارض چیزیں ہیں۔ ایک طرف تقلید کی انتہا تھی۔ دوسری طرف تحقیق کی انتہا تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان فکری اعتبار سے سکڑنا شروع ہوگئے اور مغرب فکری اعتبار سے پھیلنا شروع ہوا۔ اس فکری پھیلاؤ کے نتیجے میں تہذیبی پھیلاؤ بھی ہوا۔ مغرب کے تصورات دنیائے اسلام میں پھیلنے شروع ہوئے۔ اس کے نتیجے میں پہلے مغرب کی تہذیبی بالادستی آئی، پھر مغرب سے مرعوبیت پیدا ہوئی۔ پھر تہذیبی بالادستی اور مغرب سے مرعوبیت کے نتیجے میں سیاسی بالادستی پیدا ہوئی، بالآخر معاشی اور فنی ترقی کے نتیجے میں عسکری بالادستی سامنے آئی۔ مغربی دنیا نے سائنسی ترقی سے کام لے کر اپنی عسکری قوت کو مضبوط بنایا، ذرائع مواصلات کو بہتر بنایا اور یوں اس پوری دنیا پر کنٹرول حاصل کرنے میں اس نئے علم وفن سے کام لیا۔

یہ سلسلہ دوسوسال کے لگ بھگ جاری رہا۔ ان دوسوسالوں میں مسلمانوں کی بڑی سلطنتیں تین تھیں۔ ایک ترکی، دوسری مصر، تیسری مغل ہندوستان۔ اگرچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی مقامی آبادی کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ مسلمان اکثریت میں نہیں تھے لیکن تعداد کے اعتبار سے ترکوں سے بھی زیادہ تھے اور مصریوں سے بھی زیادہ تھے۔ پھر فکری اعتبار سے برصغیر کے مسلمان بہت نمایاں رہے ہیں اور اپنے وجود کا احساس ان میں بہت شدید رہا ہے۔ اس لیے برصغیر کے مسلمانوں کا علمی کام متعدد اعتبارات سے انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے یہ بات بہت اہم ہے کہ ہندوستان یا جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں نے اس دوران کیا سوچا، انہوں نے اس پورے دور میں کیا رویہ اختیار کیا؟ اور معاملات کو کس نقطۂ نظر سے دیکھا؟

ترکی کی سلطنت اس زمانے میں دنیائے اسلام کی سب سے بڑی سلطنت تھی۔ جو مشرقی یورپ کے بہت سے علاقوں پر محیط تھی۔ مشرق وسطیٰ کے بہت سے ممالک ترکی کا حصہ تھے اور سلطنت عثمانیہ کے صوبے کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسی طرح شمالی افریقہ کے بہت سے علاقے کم از کم نظری طور پر ترکی کا حصہ تھے۔ اس لیے ترکوں کا تجربہ پوری دنیائے اسلام پر اثر انداز ہوا۔ اگر کسی میدان میں ترکوں کو

کامیابی ہوئی تو وہ دنیائے اسلام کی کامیابی تھی۔ اگر کہیں ترکوں کو ناکامی ہوئی تو وہ دنیائے اسلام کی ناکامی تھی۔

جس زمانے میں مغربی دنیا میں یہ تبدیلیاں جاری تھیں اور اس کے نتیجے میں دنیائے اسلام اس سے متاثر ہو رہی تھی تو دنیائے اسلام میں وسیع پیمانے پر بعض حضرات کو یہ خیال پیدا ہوا کہ دنیائے اسلام کے اس زوال اور انحطاط کے عمل کو روکا جائے۔ اور مغربی دنیا کے مقابلے میں دنیائے اسلام کی آزادی اور استقلال کو برقرار رکھنے کے لیے دور رس اقدامات کیے جائیں۔ یہ احساس مصر میں بھی پیدا ہوا، ترکی میں بھی پیدا ہوا، مشرق وسطیٰ کے کئی ممالک میں پیدا ہوا۔

علماء کا کردار

اس احساس کو عمل کی صورت دینا، اس کو ایک تحریک میں بدلنا اور اس کی بنیاد پر اصلاح کی کوشش کرنا اہل علم و دانش اور ارباب سیاست و قیادت کی ذمہ داری تھی۔ تاہم یہاں سب سے اوّلین اور بنیادی ذمہ داری علماء کرام کی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ گیارہویں صدی ہجری سے لے کر تیرہویں صدی ہجری کے آخر تک ترکی کے علماء کرام بالخصوص اور دنیائے اسلام کے علماء بالعموم، ان چیلنجوں سے عہدہ برآ ہونے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ ان کی بڑی تعداد نے نہ صرف اس ضرورت کا احساس نہیں کیا بلکہ عامۃ الناس کے جذبۂ اصلاح اور احساس ناکامی کو بھی پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا، یوں ناکامی کا یہ عمل جاری رہا اور اپنی انتہا تک جا پہنچا۔ یہ ناکامی پوری دنیائے اسلام کی ناکامی تھی لیکن سب سے پہلے یہ علماء کرام کی ناکامی تھی۔

ان حالات میں ترکی کے بعض حکمرانوں کو یہ خیال ہوا، جس میں بہت سے حضرات ان کے ساتھ شریک تھے کہ ترکی کے نظام حکومت کو، فوج کے نظام کو، بیوروکریسی اور مقامی حکومتوں کے نظام کو امن و امان کے لیے کام کرنے والی ایجنسیوں کو ایک نئے انداز سے منظم کیا جائے اور اس تنظیم نو میں مغربی ممالک کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ جرمنی اور فرانس کے تجربات سے فائدہ اٹھائے جانے کی بات کی جانے لگی۔ یہاں ترکی کے علماء کرام کا یہ فریضہ تھا کہ وہ سامنے آتے اور ترک قوم کی قیادت اور عثمانی خلفاء کی رہنمائی کرتے کہ شریعت کے مقاصد اور اہداف کے نکتۂ نظر سے وہ کون سی تبدیلیاں ہیں جو نظام حکومت میں آنی چاہئیں اور وہ کون سی تبدیلیاں ہیں جو بعض لوگوں کے خیال میں قابل عمل ہیں، لیکن شریعت کے نقطۂ نظر سے قابل اعتراض ہیں، لہٰذا ان سے اعراض کیا جائے۔ یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ علماء کرام نے نہ صرف یہ کہ ایسی کوئی کوشش نہیں کی، بلکہ بحیثیت مجموعی

'تنظیمات' کے پورے عمل کی مخالفت کی۔ 'تنظیمات' کی موافقت اور مخالفت کا یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ وہ طبقہ جو علماء کرام کی رہنمائی سے مطمئن نہیں تھا اس کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا اور اس عدم اعتماد و عدم اطمینان کے بعض اسباب اور بعض مبررات بھی تھے۔

ان حالات میں ترکی کے حکمران طبقے نے تنظیمات کا ایک نقشہ مرتب کیا۔ اس نقشے کے مطابق بہت سی تبدیلیاں ترکی میں کی جانے والی تھیں۔ ان تبدیلیوں میں بعض تبدیلیاں اسلامی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض معلوم ہوتی تھیں، بعض تبدیلیاں قابل اعتراض تو نہیں تھیں لیکن ضروری بھی نہیں تھیں اور بعض تبدیلیاں ضروری اور مفید تھیں۔ ان تینوں طرح کی تبدیلیوں کے مجموعے کو تنظیمات کے نام سے عثمانی حکومت نے نافذ کرنا چاہا۔ علماء کرام نے اس پورے پیکج کی مخالفت کی۔ جو لوگ اس کے موافق تھے ان کی نظریں ان پہلوؤں پر زیادہ رہی ہوں گی جو ترکوں اور سلطنت عثمانیہ کے لیے مفید تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ علماء ایک مفید چیز کی مخالفت کر رہے ہیں۔ جن علماء نے مخالفت میں نمایاں حصہ لیا ان کی نظریں یقینا ان پہلوؤں پر تھیں جو شریعت سے متعارض یا غیر ضروری تھے۔ انہوں نے مخالفت اس لیے کی کہ یہ غیر شرعی یا غیر ضروری تبدیلیاں ہیں۔ غرض دونوں طبقوں نے محض مغربی تنظیمات کی موافقت یا مخالفت میں اپنا اپنا کردار ادا کیا۔

اس صورت حال میں علماء کرام کا یہ فرض تھا کہ وہ سنجیدگی سے غور کرتے، یہ فیصلہ کرتے کہ تنظیمات کے مثبت پہلو کیا ہیں؟ منفی پہلو کیا ہیں، جو پہلو منفی ہیں وہ کون کون سے ہیں، منفی پہلوؤں کو منفی قرار دیے جانے کے عوامل کیا ہیں؟ یہ ایک دکھ کی بات ہے لیکن امر واقعہ ہے کہ ترکی کے علماء کرام اپنی ذمہ داریوں کو مؤثر طور پر ادا نہیں کر پائے۔

ناقص نظام تعلیم

اس کے اسباب پر اگر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کے اسباب میں ایک بڑا اہم سبب نظامِ تعلیم کی نوعیت تھی۔ دنیائے اسلام میں فقہ و شریعت کی تعلیم کا نظام ایسا رہا ہے کہ اس کے نتیجے میں ایک طالب علم فقہی جزئیات کا ماہر تو ہو جاتا تھا، اس کو فقہی جزئیات تو یاد ہو جاتے تھے جو ایک بہت مفید اور ضروری عمل ہے لیکن شریعت کے کلیات، عمومی قواعد و احکام، مقاصد شریعت کی رو سے امت مسلمہ کے اہداف، امت مسلمہ کا عالمگیر کردار، قرآن مجید کے اصل قواعد اور بنیادوں سے اکثر حضرات ناواقف رہتے تھے۔ یہ بات کہ کسی معاملہ سے متعلق شرعی حکم میں ارکان اور مستحباب اور آداب کون کون سے ہیں؟ شریعت کے متعلقہ حکم پر عمل کیا جائے تو شرائط کون کون سے ہوں گی؟ یہ مہارتیں تو علماء کرام کو حاصل تھیں، اور بہت

گہرائی کے ساتھ حاصل تھیں لیکن یہ مہارتیں ان روایتی فقہی مسائل تک محدود تھیں جن کے بارہ میں قدیم فقہاء اور مجتہدین نے اجتہاد سے کام لیا تھا۔

لیکن یہ بات کہ مغربی طاقتیں بین الاقوامی تجارت کے میدان میں کیوں آگے بڑھ رہی ہیں؟ اس معاملے میں دنیائے اسلام کی تجارت کو مزید منظم کرنے اور فروغ دینے کے لیے اگر مغربی تجربات سے فائدہ اُٹھایا جائے تو ان تجربات میں کون سی چیزیں ہیں جو شریعت سے ہم آہنگ ہیں؟ کون سی چیزیں ہیں جو ہم آہنگ نہیں ہیں؟ یہ فیصلہ کرنا ایک مجتہدانہ بصیرت کا متقاضی تھا۔ افسوس یہ ہے کہ ایسی مجتہدانہ بصیرت علماء کرام کی ایک بڑی تعداد میں موجود نہیں تھی۔ بہت سے علماء تو وہ تھے جو سرے سے اجتہاد کی ضرورت ہی کے قائل نہیں تھے۔ ان کے خیال میں اجتہاد کا دروازہ عرصہ ہوئے بند ہو چکا تھا۔ وہ اجتہاد کے معنی صرف یہ سمجھتے تھے کہ امام ابوحنیفہؒ یا امام شافعیؒ کے کام کو دریا برد کر کے نئے سرے سے انہی کی طرح تعبیر شریعت کے اصول وضع کیے جائیں۔

جزوی معاملات میں اجتہاد یا نئے پہلوؤں میں اجتہاد کا تصور شاید ان کے ذہنوں میں نہیں رہا تھا۔ اس لیے یہاں علماء کرام صحیح رہنمائی فراہم نہیں کر سکے۔ بعض ایسے امور کی انہوں نے مخالفت کی جس کا نقصان اسلام کو بھی ہوا، مسلمانوں کو بھی ہوا، ترکوں کو بھی ہوا۔ مثال کے طور پر مغربی دنیا میں پرنٹنگ پریس کافی عرصہ پہلے سے رائج ہو چکا تھا۔ جب ترکی میں پرنٹنگ پریس لگانے کی تجویز آئی جو مغربی دنیا کے کئی سو سال بعد آئی، جب مغربی دنیا میں ہزاروں کتابیں چھپ کر گھر گھر اور گلی گلی تقسیم ہو چکی تھی، اس وقت بعض ترک حکمرانوں کو یہ خیال آیا کہ ترکی میں بھی پرنٹنگ پریس لگایا جائے۔ علماء کرام نے اس تجویز کی شدید مخالفت کی۔ پریس لگانے کو اسلام کے لیے خطرہ سمجھا، دنیائے اسلام کے مفاد کے خلاف سمجھا۔ کیوں سمجھا؟ کن بنیادوں پر سمجھا؟ یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ خاصی ردوقدح کے بعد علماء کرام نے پرنٹنگ پریس لگانے کی اجازت اس شرط پر دی کہ اس پرنٹنگ پریس میں اسلامی کتابیں نہیں چھاپی جائیں گی۔ قرآن مجید شائع نہیں ہوگا۔ تفسیر، حدیث کی کتابیں شائع نہیں ہوں گی۔ فقہ اور شریعت کی کتابیں شائع نہیں ہوں گی۔ گویا علماء کرام نے خود یہ راستہ کھلا چھوڑا کہ پرنٹنگ پریس کی سہولت سے اسلام کے خلاف یا غیر اسلامی تحریریں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں چھاپ چھاپ کر بانٹنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اسلام کے پیغام پر مبنی کوئی کتاب شائع کر کے تقسیم کرنا اور گھر گھر پہنچانا درست نہیں۔ نتیجہ جو نکلنا تھا وہ ظاہر ہے۔

تنظیمات

اس ایک مثال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ترکی میں علماء کرام نے کس انداز سے تنظیمات کو دیکھا ہوگا اور عثمانی خلفاء کی کیا اور کس انداز سے ''رہنمائی'' کی ہوگی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تنظیمات کے نام پر مغرب کی

نقالی کے ایک عمل کا آغاز ہوگیا۔ اس زمانے کے عثمانی حکمرانوں نے یہ سمجھا کہ اگر مغربی لباس اختیار کرلیا جائے یا اس کی کوئی ترمیمی شکل اپنالی جائے تو ترک فوجوں میں وہی تنظیم پیدا ہوجائے گی جو جرمنی یا فرانس کی افواج میں تھی۔ یہ ایک ایسی مضحکہ خیز بات تھی جس کی مضحکہ خیزی آج واضح ہے۔ فوج کی تنظیم کے لیے نہ اسلحے کو بہتر بنایا جائے، نہ تربیت کو بہتر بنایا جائے، نہ تصور جنگ پر غور کیا جائے، نہ جنگ کے طریقہ کار میں کوئی بہتری لائی جائے، صرف سپاہیوں کے لباس میں قدیم ترکی شلوار کی جگہ پتلون پہنا دی جائے تو فوج جرمنی کے خلاف لڑنے میں کامیاب ہوجائے گی۔ اس طرح کی بہت سی مضحکہ خیز چیزوں پر مبنی، جس میں بعض چیزیں مفید بھی تھیں، تنظیمات کے نظام کو اپنالیا گیا۔ نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہیے تھا۔ مغرب کی نقالی کا ایک عمل شروع ہوگیا۔ جب کسی قوم میں نقالی کا عمل شروع ہوجائے تو پھر وہ نقالی ہر چیز میں ہوتی ہے اور جیسے جیسے نقال نقل کرتا جاتا ہے اس کی مقلدانہ ذہنیت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ مقلد تقلید کر کے مجتہد کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ تقلید کا میدان الگ ہے، اجتہاد کا میدان الگ ہے۔ قیادت کا میدان مجتہد کے ہاتھ میں ہوتا ہے، مقلد کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ ایک مقلد اپنے سے کم تر مقلدوں کا لیڈر تو ہوسکتا ہے کسی مجتہد کا لیڈر نہیں ہوسکتا۔ جو عسکری فنون میں اجتہاد سے کام لے گا، وہ قیادت کا فریضہ انجام دے گا۔ عسکری مقلد عسکری مجتہد کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یہ بات نہ ترک علماء کی سمجھ میں آئی اور نہ ترک حکمرانوں کی سمجھ میں آئی۔

تزکیۂ نفس

مولانا امین حسن اصلاحی

روزے کی آفات اور اُن کا علاج

روزے کی برکات میں سے جو چند ہم نے بیان کی ہیں (روح ملکوتی کی آزادی، سدّ ابواب فتنہ، قوت ارادی کی تربیت، جذبۂ ایثار کی پرورش اور قرآن مجید سے مناسبت) یہ صرف اس صورت میں ظاہر ہوتی ہیں جب آدمی اپنے روزے کو ان تمام آفتوں سے محفوظ رکھ سکے جو روزے کو خراب کردینے والی ہیں۔ یہ آفتیں چھوٹی اور بڑی بہت سی ہیں۔ ہم تزکیۂ نفس کے طالبوں کی واقفیت کے لیے یہاں چند بڑی آفتوں کا ذکر کریں گے اور ساتھ ہی ان کے وہ علاج بھی بتائیں گے جو قرآن وحدیث میں بیان ہوئے ہیں تاکہ جو لوگ اپنے روزوں کی حفاظت کرنا چاہیں، ان سے اپنے آپ کو بچاسکیں۔

لذتوں اور چٹخاروں کا شوق

روزے کی عبادت اس لیے مقرر کی گئی ہے کہ آدمی اپنی خواہشوں پر قابو پاسکے۔ یہ مقصد اسی

صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جب آدمی اس مقصد کو روزوں میں ملحوظ رکھے اور ان رغبتوں کو حتی الامکان دبائے جن کے آگے اپنی روزمرہ زندگی میں وہ اکثر بے بس ہوجایا کرتا ہے اور یہ بے بسی اس کو بہت سی اخلاقی اور شرعی کمزوریوں میں مبتلا کردیتی ہے لیکن بہت سے لوگ اس مقصد کو بالکل محفوظ نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک روزے کا مہینہ خاص کھانے پینے کا مہینہ ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اس مہینے میں کھانے پینے پر جتنا بھی خرچ کیا جائے، خدا کے ہاں اس کا کوئی حساب نہیں ہوگا۔ اس خیال کے لوگ اگر خوش قسمتی سے کچھ خوش حال بھی ہوتے ہیں تو پھر تو فی الواقع ان کے لیے روزوں کا مہینہ کام و دہن کی لذتوں سے متمتع ہونے کا موسم بہار ہی بن کے آتا ہے۔ وہ روزے کی پیدا کی ہوئی بھوک اور پیاس کو نفس کشی کے بجائے نفس پروری کا ذریعہ بنالیتے ہیں۔ وہ صبح سے لے کر شام تک طرح طرح کے پکوانوں کے پروگرام بنانے اور ان کے تیار کرانے میں اپنے وقت صرف کرتے ہیں اور افطار سے لے کر سحر تک اپنی زبان اور اپنے پیٹ کی تواضع میں اپنا وقت گزارتے ہیں۔ میں ایک ایسے بزرگ سے واقف ہوں جو ایک دیندار آدمی تھے لیکن ان کا نظریہ یہ تھا کہ رمضان کا مہینہ کھانے پینے کا خاص مہینہ ہے چنانچہ اس نظریہ کے تحت وہ رمضان کے مہینے کے لیے کھانے پینے کی مختلف چیزوں کا اہتمام بہت پہلے سے شروع کردیتے تاکہ رمضان میں ان کے تنوعات سے متمتع ہوسکیں۔

ہر شخص جانتا ہے کہ روزہ کھانے پینے کے شوق کو اکسا دیتا ہے لیکن روزے کا مقصود اسی اکساہٹ کو دبانا ہے نہ کہ اس کی پرورش کرنا۔ اس وجہ سے صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی قوت کار کو باقی رکھنے کے لیے کھائے پیے تو ضرور، لیکن ہرگز ہرگز کھانے پینے کو اپنی زندگی کا موضوع نہ بنالے جو کچھ بغیر کسی خاص سرگرمی اور بغیر کسی خاص اہتمام کے میسر آجائے اس کو صبر وشکر کے ساتھ کھالے۔ اگر کوئی چیز پسند کے خلاف سامنے آئے تو اس پر بھی گھر والوں پر غصہ کا اظہار نہ کرے۔ اگر کسی کو خدا نے فراغت و خوشحالی دی ہو تو اسے چاہیے کہ وہ خود اپنے کھانے پینے پر اسراف کرنے کی بجائے غریب اور مسکین روزہ داروں کی مدد اور ان کو کھلانے پلانے پر خرچ کرے۔ اس چیز سے اس کے روزے کی روحانیت اور برکت میں بڑا اضافہ ہوگا۔ رمضان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فیاضی اپنے عروج پر ہوتی تھی۔ روزہ افطار کرانے کے ثواب سے متعلق ایک حدیث کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

> زید بن خالدؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جس نے کسی روزہ دار کو افطار کرایا، اس کے لیے روزہ دار کے برابر اجر ہے اور اس سے روزہ دار کے اجر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ (سنن ترمذی)

اشتعال طبیعت

آدمی جب بھوکا پیاسا ہوتو قاعدہ ہے کہ اس کا غصہ بڑھ جایا کرتا ہے جہاں کوئی بات ذرا بھی اس کے مزاج کے خلاف ہوئی فوراً اس کو غصہ آجاتا ہے۔ روزے کے مقاصد میں سے یہ چیز بھی ہے کہ جن کی طبیعتوں میں غصہ زیادہ ہو وہ روزے کے ذریعہ سے اپنی طبیعتوں کی اصلاح کریں لیکن یہ اصلاح اسی صورت میں ہوسکتی ہے جب آدمی روزے کو اپنی طبیعت کی اس خرابی کی اصلاح کا ذریعہ بنائے۔ اگر وہ اس کو اپنی طبیعت کی اصلاح کا ذریعہ نہ بنائے تو اس بات کا بڑا اندیشہ ہے کہ روزہ اس پہلو سے اس کے لیے مفید ہونے کے بجائے اُلٹا مضر ہوجائے یعنی اس کی طبیعت کا اشتعال کچھ اور زیادہ ترقی کرجائے۔ جو شخص اس کو اپنی اصلاح کا ذریعہ بنانا چاہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ جب اس کی طبیعت میں اشتعال پیدا ہو یا کوئی دوسرا اس کے اندر اشتعال کو پیدا کرنے کی کوشش کرے تو وہ فوراً اس بات کو یاد کرے کہ 'اناصائم' یعنی میں روزے سے ہوں اور یہ چیز روزے کے مقصد کے بالکل منافی ہے۔ یہ طریقہ اختیار کرنے سے آدمی کو غصہ پر قابو پانے کی تربیت ملتی ہے اور آہستہ آہستہ یہ تربیت اس کے مزاج کو بالکل بدل دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کو اپنے غصہ پر اس حد تک قابو حاصل ہوجاتا ہے کہ اس کو وہ وہیں استعمال کرتا ہے جہاں وہ اس کو استعمال کرنا چاہتا ہے۔

لیکن بہت سے لوگ اسلام کے بتائے ہوئے اس اصول کے بالکل خلاف روزے کو سپر کی بجائے تلوار کے طور پر استعمال کرنے کے عادی بن جاتے ہیں یعنی روزہ ان کے لیے ضبطِ نفس کے بجائے اشتعالِ نفس کا بہانہ بن جایا کرتا ہے۔ وہ بیوی پر، بچوں پر، نوکروں پر، ماتحتوں پر، ذرا ذرا سی بات پر برس پڑتے ہیں، صلواتیں سناتے ہیں، گالیاں بکتے ہیں اور بعض حالات میں مار پیٹ سے بھی دریغ نہیں کرتے اور پھر اپنے آپ کو اس خیال سے تسلی دے لیتے ہیں کہ کیا کریں، روزے میں ایسا ہو ہی جایا کرتا ہے۔

جو لوگ اپنے نفس کو اس راہ پر ڈال دیتے ہیں، ان کے لیے روزہ اصلاحِ نفس کا ذریعہ بننے کی بجائے ان کے بگڑے ہوئے نفس کو بگاڑنے کا مزید سبب بن جایا کرتا ہے۔ جو روزہ بھی وہ رکھتے ہیں وہ ان کے نفس مشتعل کے لیے چابک کا کام دیتا ہے جس سے ان کا نفس تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے۔ جو شخص روزے کی برکتوں سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ روزے کو اپنے نفس کے لیے ایک لگام کے طور پر استعمال کرے اور ہر اشتعال دلانے والی بات کو اسی سپر پر روکے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ تجربہ گواہی دیتا ہے کہ اگر روزے کے احترام کا یہ احساس طبیعت پر غالب رہے تو آدمی بڑی بڑی ناگوار بات بھی برداشت کرجاتا ہے اور اس پر کوئی احساسِ کمتری طاری نہیں ہوتا بلکہ

اس طرح کی آزمائش کے جتنے مواقع اس کے سامنے آتے ہیں وہ ہر موقع پر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے شیطان پر ایک فتح حاصل کی ہے اور اس فتح کا احساس اس کے غصہ کو ایک راحت واطمینان کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے۔

دل بہلانے والی چیزوں کی رغبت

روزے کی ایک عام آفت یہ بھی ہے کہ بہت سے لوگ جن کے ذہن کی تربیت نہیں ہوئی ہوتی، کھانے پینے اور زندگی کی بعض دوسری دلچسپیوں سے علیحدگی کو ایک محرومی سمجھتے ہیں اور اس محرومی کے سبب سے ان کے لیے دن کاٹنے مشکل ہوجاتے ہیں۔ اس مشکل کا حل وہ یہ پیدا کرتے ہیں کہ بعض ایسی دلچسپیاں تلاش کر لیتے ہیں جو ان کے خیال میں روزے کے مقصد کے منافی نہیں ہوتیں مثلاً یہ کہ تاش کھیلتے ہیں، ناول، ڈرامے اور افسانے پڑھتے ہیں، ریڈیو پر گانے سناتے ہیں، دوستوں میں بیٹھ کر گپیں ہانکتے ہیں اور بعض من چلے سینما کے ایک آدھ شو دیکھ آنے میں بھی کوئی قباحت نہیں خیال کرتے۔

سب سے زیادہ سہل الحصول دلچسپی بعض لوگ یہ پیدا کر لیتے ہیں کہ اگر ایک دو ساتھی میسر آجائیں تو کسی کی غیبت میں لپٹ جاتے ہیں۔ روزے کی بھوک میں آدمی کا گوشت بڑا لذیذ معلوم ہوتا ہے اور تجربہ گواہی دیتا ہے کہ اگر روزہ رکھ کے آدمی کو یہ لذیذ مشغلہ مل جائے تو آدمی جھوٹ، غیبت، ہجو اور اس قسم کی دوسری آفتوں کا جن کو حدیث میں حصائد اللسان سے تعبیر کیا گیا ہے، ایک انبار لگا دیتا ہے اور اسی مشغلہ میں صبح سے شام کر دیتا ہے۔ یہ چیزیں آدمی کے روزے کو بالکل برباد کر کے رکھ دیتی ہیں۔

ان کا ایک علاج تو یہ ہے کہ آدمی خاموشی کو روزے کے ضروری آداب میں سے سمجھے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ پچھلے مذاہب میں چپ رہنا بھی روزے کی شرائط میں داخل تھا چنانچہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام روزہ کی حالت میں صرف اشارہ سے بات کرتی تھیں۔ اسلام نے روزہ داروں پر یہ پابندی تو عائد نہیں کی ہے لیکن اس پابندی کے نہ ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی روزے میں اپنی زبان کو چھوٹ دے دے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی ضروری اور مفید بات کرنے کا موقع پیش آجائے تو کر لے ورنہ خاموش رہے۔ جو شخص ہر قسم کی اناپ شناپ اور جھوٹی سچی باتیں زبان سے نکالتا رہتا ہے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ پھر اس کا محض کھانا پینا چھوڑ دینا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک بالکل بے نتیجہ کام ہے:

'حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ 'نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔' (صحیح بخاری)

اس کا دوسرا علاج یہ ہے کہ آدمی کا جو وقت گھر کے کام کاج اور معاش کی مصروفیتوں سے فاضل بچے اس کو مفید چیزوں کے مطالعہ میں صرف کرے۔ روزے کے دنوں کے لیے قرآن شریف، حدیث شریف، سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، سیرت صحابہؓ، اور تزکیۂ نفس کی کتابوں کے مطالعہ کا ایک باقاعدہ پروگرام بنالے۔ خصوصیت کے ساتھ قرآن مجید کے تدبر پر پابندی کے ساتھ کچھ نہ کچھ وقت ضرور صرف کرے۔ قرآن مجید کو روزے کی عبادت کے ساتھ، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، ایک خاص مناسبت ہے۔ اس مناسبت کے سبب سے روزہ دار پر قرآن کی خاص برکتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ہر روزہ دار کو ان برکتوں کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

قرآن مجید اور ماثور دعاؤں کے یاد کرنے کے لیے بھی آدمی کچھ نہ کچھ وقت ضرور نکالے۔ اس طرح قرآن مجید اور مسنون دعاؤں کا آدمی کے پاس آہستہ آہستہ ایک ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے جو آدمی کے جمع کیے ہوئے مال و اسباب کے ذخیروں سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

ریا

ریا کا فتنہ جس طرح تمام عبادتوں کے ساتھ لگا ہوا ہے اسی طرح روزے کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے۔ بہت سے لوگ روزے تو رکھتے ہیں، بالخصوص رمضان کے روزے لیکن ہوسکتا ہے کہ ان میں بہت کچھ دخل اس احساس کو بھی ہو کہ روزے نہ رکھے تو پاس پڑوس کے روزہ داروں میں نکّو بننا پڑے گا یا لوگوں میں جو دینداری کا بھرم ہے وہ جاتا رہے گا یا اپنے گھر اور خاندان والے ہی بُرا مانیں گے۔ اس طرح کے مختلف احساسات ہیں جو رمضان کے روزوں میں شریک بن جاتے ہیں اور اس طرح وہ خلوصِ نیت آلودہ اور مشتبہ ہو جایا کرتا ہے جو روزے کی حقیقی برکتوں کے ظہور کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے کہ جس بندے میں خدا کی خوشنودی کے سوا کوئی اور محرک شریک ہو جائے یہ روزہ وہ روزہ نہیں ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ:

'بندہ میرے لیے اپنا کھانا پینا اور اپنی شہوت چھوڑتا ہے، روزہ میرے لیے ہے اور میں اس کا بدلہ دوں گا'

بلکہ یہ روزہ اسی غرض کے لیے ہو جائے گا جس غرض کے لیے رکھا گیا ہے۔

اس آفت کا اوّل علاج تو یہ ہے کہ آدمی اپنی نیت کو ہر دوسرے شائبہ سے حتی الامکان پاک کرنے کی کوشش کرے۔ ہر روزا سے سوچنا چاہیے کہ اپنے روزے کو تمام برکتوں سے محروم کر کے فاقہ کے درجہ میں ڈال دینا انتہائی نادانی ہے، آخر یہ مشقت اُٹھانے کا حاصل کیا ہوا جب کہ یہ دنیا میں بھی موجب کلفت اور آخرت میں بھی موجب وبال بنے۔ اس طرح نفس کے سامنے بار بار روزہ کی قدر و قیمت واضح کرنی چاہیے تا کہ اس کی نگاہ دوسروں کی طرف سے ہٹ کر خدا کی طرف متوجہ ہو۔

اس کا دوسرا علاج یہ ہے کہ آدمی رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ نفلی روزے بھی رکھے اور اس میں دو باتوں کا اہتمام کرے: ایک حتی الامکان اخفا کا، یعنی ان کا اشتہار دینے کی کوشش نہ کرے۔ دوسرے اعتدال یا میانہ روی کا یعنی نفلی روزے اسی حد تک رکھے جس حد تک خواہش و شہوات کو حالتِ اعتدال پر لانے کے لیے ان کی ضرورت ہو۔ اگر اس حد سے آدمی بڑھ جائے گا تو یہ چیز خود بھی ایک فتنہ ہے اور اسلام نے اس سے بھی بڑی شدت کے ساتھ روکا ہے۔ روزے کی حیثیت ایک دوا کی ہے، دوا اگر ضرورت سے زیادہ استعمال کر لی جائے تو بسا اوقات یہ خود بھی ایک بیماری بن جاتی ہے۔

ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی

روزے کے طبی فوائد

طبّی لحاظ سے روزوں کے بے شمار فوائد ہیں۔ روزوں کے نہ صرف روحانی بلکہ جسمانی فوائد بھی ہیں۔ بقول پروفیسر ڈاکٹر ایم زیڈ کندی' روزوں کے طبی فوائد حسب ذیل ہیں:

(i) انسان دو پہر کا کھانا نہ کھائے تو وہ ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔ روزوں کا بھی یہی فائدہ ہے۔ انسان ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔

(ii) کم کھانا ویسے بھی اچھی عادت ہے اور طبّی لحاظ سے فائدہ مند ہے۔ روزوں میں ذہن زیادہ اچھا کام کرتا ہے۔

(iii) اگر کم کھایا جائے اور افطار میں احتیاط برتی جائے اور سحری کے وقت بھی کم کھایا جائے تو اس سے وزن کم ہوتا ہے جو طبّی لحاظ سے فائدہ مند ہے۔

(iv) روزوں میں جسم کی چربی کم ہوتی ہے۔ اس طرح دوران خون بہتر ہوتا ہے اور دل کے امراض کم ہوتے ہیں۔

کینیا کے قبائل کی مثال

بقول پروفیسر ڈاکٹر ایم زیڈ کندی: ''انہوں نے کینیا میں ۷۲-۱۹۷۱ء کے دوران مختلف قبائل پر تحقیقات کیں جو خانہ بدوش تھے۔ یہ لوگ کم کھانا کھاتے۔ زیادہ تر جانوروں کا گوشت کھاتے اور چھ چھ ماہ تک اسی قسم کی ہلکی غذا پر ہی گزارا کرتے۔ کئی دفعہ فاقہ کشی بھی کرتے۔ ان قبائل میں دل کے امراض بالکل نہیں تھے''۔

اسی طرح ۱۹۹۳ء میں ڈاکٹر کندی صاحب نے پاکستان میں بھی تحقیق کی جس میں رمضان المبارک سے قبل اور بعد میں جسم میں کولیسٹرول کی مقدار کا موازنہ کیا گیا۔ اس موازنہ سے یہ بات سامنے آئی کہ روزہ رکھنے سے کولیسٹرول کم ہوتا ہے۔ کولیسٹرول اگر کم ہو تو دل کا دورہ نہیں پڑتا۔ اس کے علاوہ پروفیسر ڈاکٹر محمود علی ملک کا خیال ہے کہ یہ فائدہ اسی صورت میں ہے کہ روزہ دار خوراک میں اعتدال رکھے۔

روزوں کے طبی فوائد

معدے کی تکالیف: روزہ رکھنے سے معدے کی تکالیف اور بیماریاں ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ روزوں میں معدہ خالی رہنے سے معدے کی تکالیف دور ہوتی ہیں۔ یہ روزوں کا ایک بہت بڑا فائدہ ہے۔

انسانی جسم اللہ تعالیٰ کا ایک کرشمہ ہے۔ روزوں میں شروع میں بھوک لگتی ہے لیکن یہ بھوک ختم ہو جاتی ہے کیونکہ جسم کے اندر ذخیرہ شدہ چربی اور دیگر اجزاء جو (سٹور ہوتے ہیں) ضرورت پڑنے پر استعمال ہوتے ہیں۔ جسم کے اندر تھرموسٹیٹ موجود ہے جسے طبّی اصطلاح میں (Homeostatis) کہا جاتا ہے۔ جسم کا درجہ حرارت اور جسم کی خوراک کی ضرورت خود بخود پوری ہوتی رہتی ہے۔ جگر کے اندر غذائی ضروریات کے عناصر سٹور ہوتے ہیں جو بوقت ضرورت جگر جسم کو مہیا کرنا شروع کر دیتا ہے۔

جسم میں گلوکوز اور نمکیات کی کمی ہو جاتی ہے اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھجور یا نمک سے افطار کا حکم دیا۔ نمکیات یا گلوکوز کی ضرورت کھجور یا نمک سے پوری ہو جاتی ہے۔ پاکستان میں موسم زیادہ تر گرم ہوتا ہے۔ پسینے میں نمکیات خارج ہوتے ہیں۔ نمک یا کھجور سے یہ کمی بھی پوری ہو جاتی ہے۔

کھجور کے فوائد طبی لحاظ سے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھجور کو مسلمان درخت سے تشبیہ دی۔ اس میں بے شمار فوائد ہیں۔ مسند احمد میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ آلہ وآلہ وسلم نے اس سے دل کے ایک مریض کا علاج فرمایا اور سات عجوہ کھجوریں روزانہ کھلائیں۔ حدیث شریف میں درج ہے کہ کھجور کھانے سے قولنج نہیں ہوتا۔ یہ دل بڑھ جانے کی

بھی دوا ہے۔ الغرض یہ ایک مکمل خوراک ہے۔ جدید طبی تحقیق کے مطابق کھجور میں مندرجہ ذیل اجزاء ہیں:

فولاد	:	۱ء۶۱
سلفر	:	۵۱ء۶
کیلشیم	:	۶۷ء۹
میگنیشیم	:	۵۸ء۹
سوڈیم	:	۴ء۸
پروٹین	:	۲ء۰۰
پوٹاشیم	:	۷ء۵۴
فاسفورس	:	۶ء۳۸
کلوری ۱۰۰ جی ایم	:	۲۷۰
کلورائیڈ	:	۲ء۹۰
تانبہ	:	۲۱ء

روزوں کے بارے میں ڈاکٹر ژوفرائے کی رائے

ڈاکٹر حمید اللہ فرماتے ہیں: ''ایک یورپین غیر مسلم ڈاکٹر ژوفرائے نے ایک کتاب بعنوان ''روزہ'' لکھی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ روزہ نہ صرف طبّی نقطہ نگاہ سے انسانوں کے لیے مفید ہے بلکہ کائنات کی دیگر مخلوقات کے لیے بھی یہ حیات نو کا مژدہ سناتا ہے۔ قطبین میں اور دیگر جگہوں پر وحشی جانور کئی کئی ماہ برف باری کے دوران بغیر کھائے رہتے ہیں۔ جانور' پرندے' سانپ وغیرہ سب پہاڑوں کی غاروں میں چلے جاتے ہیں اور وہیں سو جاتے ہیں۔ اس کو ہائیبر نیشن (Hibernation) کہتے ہیں۔ یعنی موسم سرما کی نیند۔ بغیر کھائے پیے یا روزے کی حالت میں کئی ماہ گزرانے کے باوجود یہ جانور نہیں مرتے بلکہ موسم بہار میں حیات نو لے کر آتے ہیں۔ پرانے پر جھڑ جاتے ہیں پرانی کھالیں اُتر جاتی ہیں اور نیا چمڑا' کھال یا لباس پہن کر یہ دوبارہ زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ اشجار سردیوں میں جھڑ جاتے ہیں کوئی پانی نہیں دیا جاتا پھر موسم بہار میں نت نئے رنگوں سے یہ اپنی کونپلیں نکالتے ہیں۔ نئی جوانی' نیا حسن اور نئی قوت لے کر آتے ہیں۔

(بحوالہ: ڈاکٹر محمد حمید اللہ' خطبات بہاول پور' صفحات ۸۔۲۰۷)

ڈاکٹر ژوفرائے کے نزدیک آج کل ایسی عجیب اور پیچیدہ بیماریاں ظاہر ہو چکی ہیں کہ جن کا ابھی تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا۔ ان کا علاج طویل یا مختصر فاقہ کشی سے کیا جا سکتا ہے۔ ان کے تجربات

اورتحقیقات کا نچوڑ یہ ہے کہ انسانوں کو ہر سال سات ہفتے روزے رکھنے چاہئیں۔اس طرح یہ کل روزے سالانہ بیالیس بنتے ہیں۔ پاکستان میں بھی جوتحقیقات ہوئی ہیں ان کی روشنی میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ روزہ طبّی لحاظ سے انسانوں کے لیے مفید ہے۔ ڈاکٹر فتح خان اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے یورالوجسٹ ڈاکٹر سجاد حسین اپنی تحقیق سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ گردے کے جو مریض روزے رکھتے ہیں ان کا یورک ایسڈ (Uric Acid) کم ہو جاتا ہے۔

اسلام اور سائنس　　　وسیم الطاف

سائنس اور ہماری ترجیحات

[البرہان میں اسلام، سائنس اور ٹیکنالوجی پر جو بحث جاری ہے، اس کا ایک پہلو وہ بھی ہے جو ہم نے اپنے ایک ذہین قاری آفتاب عروج صاحب (چنیوٹ) کے اصرار پر شامل اشاعت کر دیا ہے (دیکھیے اسی شمارے میں ان کا خط بزم قارئین میں)۔اس بحث کے اختتام پر البرہان بھی اپنا نقطۂ نظر، ان شاءاللہ، پیش کرے گا] مدیر

’’ہم انتہائی عسرت اور ناداری کی زندگی گزار رہے تھے، تاہم ہمارے گھر میں کتابیں تھیں۔‘‘

یہ الفاظ ہیں اسرائیل سے تعلق رکھنے والے ’ادایوناتھ‘ کے جس نے ۲۰۰۹ء میں کیمیا میں نوبل انعام حاصل کیا تھا۔ ۶۰ لاکھ اسرائیلی ہر سال ایک کروڑ بیس لاکھ کتابیں خریدتے ہیں اور اس طرح دنیا میں آج کے انٹرنیٹ کے دور میں، سب سے زیادہ کتابیں خریدنے والی قوم کہلاتے ہیں۔علم تعلیم سے آتا ہے اور اسرائیل جنوب مغربی ایشیا کے مسلم اکثریتی علاقے میں سکول جانے والے بچوں میں سب سے

آ گے ہے۔ اس طرح اس کی خواندگی کی شرح بھی علاقے میں سب سے زیادہ ہے۔اسرائیل میں ۳ سے ۱۸ سال کی عمر کے بچوں پر تعلیم لازمی طور پر حاصل کرنے کی پابندی ہے۔اسرائیل اپنے ایک شہری پر سالانہ ۱۱۰ ڈالر سائنس کی تحقیق پر خرچ کرتا ہے۔ دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں میں سے ۶ کا تعلق اسرائیل سے ہے۔ ہر دس ہزار اسرائیلیوں کے لیے ۱۴۵ سائنسدان اور انجینئرز ہیں۔

اس کے مقابلے میں پاکستان کا زیرو فیصد بھی امکان نہیں ہے کہ وہ ۲۰۱۵ء تک بھی Millenium Development Goals in Education حاصل کر سکے۔تاہم ہندوستان ،بنگلہ دیش اور سری لنکا اس راستے پر صحیح طور پر سفر کر رہے ہیں۔دنیا کے سکول جانے والے دس بچوں میں سے صرف ایک پاکستانی ہوتا ہے۔شرح خواندگی بڑھانے کے لیے پاکستان کو تقریباً ۱۰۰ ارب روپے مزید خرچ کرنا ہوں گے جو کہ موجودہ کل تعلیمی بجٹ سے ۵۰ فیصد زیادہ بنتا ہے۔

اسرائیل جو کہ دنیا میں سب سے زیادہ خطرات میں گھرا ہوا ہے، ۱۹۸۱ء تک اپنی کل مجموعی قومی پیداوار کا ۲۴ فیصد دفاع پر خرچ کرتا تھا لیکن اب اُس نے یہ بجٹ ۷.۳ فیصد کر دیا ہے اور اس کی بجٹ کی زیادہ تر Allocations معیشت کے پیداواری سیکٹرز کی طرف منتقل ہوگئی ہیں۔اسرائیل کے مقابلہ میں ہم اپنی خالص آمدنی کا ۵۰ فیصد دفاع پر خرچ کرتے ہیں۔ چونکہ ہم اسلحہ کی خریداری عام طور پر قرضوں کے ذریعے کرتے ہیں اس لیے ان قرضہ جات کا کوئی اکاؤنٹ نہیں ہے۔ ہماری خالص آمدنی کا تقریباً ۵۰ فیصد حصہ قرضوں کے سود کی ادائیگی پر صرف ہو جاتا ہے۔علم سے پیار یہودیوں کا بنیادی وصف ہے اور یہ چیز ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ حالیہ تاریخ کی چار سب سے زیادہ موثر شخصیات میں سے تین کا تعلق یہودیوں کی نسل سے ہے۔ چارلس ڈارون کو چھوڑ کر کارل مارکس ،سگمنڈ فرائیڈ اور آئن سٹائن سب یہودی قوم سے تھے۔اب تک صرف طبیعیات میں ۴۵ یہودی النسل سائنسدانوں نے نوبل انعام حاصل کیا ہے۔

اسی طرح کیمیا میں اوریجنل تحقیقی کام کے صلہ میں ۲۶ یہودی سائنسدان نوبل انعام پا چکے ہیں۔ میڈیسن اور فزیالوجی میں اب تک ۵۲ ایسے لوگ نوبل انعام جیت چکے ہیں جو پیدائشی یہودی تھے۔اسی طرح یہودی النسل ۱۲ ادیب اور ۲۱ معیشت دان نوبل انعام جیت چکے ہیں۔ ۹ یہودی اب تک امن کی کوششوں کے صلہ میں نوبل انعام سے نوازے جا چکے ہیں۔دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کی آبادی کا ۰.۳ فیصد یہودی اب تک ۲۴ فیصد نوبل انعام حاصل کر چکے ہیں جب کہ مسلمان دنیا کی آبادی کا ۲۲ فیصد ہیں اور پچھلے ۸۰۰ سالوں میں طب ،معیشت ،طبیعیات ، کیمیا غرض کسی بھی میدان میں ان کا

کوئی حصہ نہیں ہے۔ایک یہودی ماں کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا بیٹا سائنسدان بنے نہ کہ کسی ریاست کا سربراہ۔آئن سٹائن کو بھی اسرائیل کی صدارت کی آفر ہوئی تھی جو اُس نے رد کردی۔

تعلیم یہودیوں کی خاندانی اقدار کی بنیاد ہے۔انہیں علم سے پیار کرنا سکھایا جاتا ہے کیونکہ اسی چیز کی خاندان میں قدر ہے۔گھروں اور خاندانوں میں علم والے کی اہمیت ہے اُسی کی تعریف کی جاتی ہے اور اس کی مختلف انداز سے حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور یہی چیز ان کے قومی کردار کا لازمہ بن جاتی ہے۔جو ریاست اور معاشرہ علم اور علم والوں کو عزت بخشتا ہے اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں توڑ سکتی کیونکہ ٹیکنالوجی سائنسی علم کو بنیاد بناتی ہے اور جس کے پاس ٹیکنالوجی ہے وہ طاقتور ہے۔

اسرائیل کی مصر، شام، اُردن اور عراق سے لڑی جانے والی جنگ صرف ۶ دن میں ختم ہوگئی اور نتیجہ میں تمام عرب ملک مفتوح ہوگئے۔۶ دن کی جنگ میں اسرائیل نے مصر سے غزہ کا علاقہ اور سنائی کا جزیرہ چھین لیا، شام سے گولان کی پہاڑیاں اور مغربی ساحل اور اُردن سے مشرقی یروشلم چھین لیا۔جنگ میں یہودیوں کے صرف ۷۷۹ فوجی مرے جب کہ مسلمانوں کے ۲۱۰۰۰ بندے کام آئے۔

تقریباً ڈیڑھ ارب مسلمانوں کا دنیا کی ترقی میں حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔اس کے برعکس ڈیڑھ کروڑ یہودیوں کی اس سلسلے میں کاوشیں ان گنت ہیں۔ڈاکٹر عبدالسلام اپنے مذہبی عقیدے کی وجہ سے اپنے ہی ملک میں غیر سمجھے گئے۔ایک اور مسلم نوبل انعام حاصل کرنے والے احمد زویل امریکی شہری تھے اور انہوں نے اپنا سارا کام امریکہ میں ہی انجام دیا۔نجیب محفوظ، ایک مصری ادیب، کو اپنے ملک میں ایک شدت پسند کے ہاتھوں زخمی ہونا پڑا۔انسانی حقوق کی علمبردار ایرانی نژاد شیرین عبادی کو اپنے ملک میں اتنا خوف زدہ کیا گیا کہ اسے کینیڈا میں پناہ لینا پڑی۔ترکی کے نوبل انعام یافتہ ناول نگار 'اورسان پاموک' پر اس کی حکومت نے مجرمانہ الزام لگایا کہ اس نے عثمانی عہد میں آرمینیائی اور کرد باشندوں کے قتل عام کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔

اس وقت پوری دنیا کے مسلمانوں میں صرف ایک فیصد سائنسدان ہیں۔اکثر ممالک اس وقت شدت پسندوں کے کنٹرول میں ہیں جو صرف نفرت کی تبلیغ کرتے ہیں اور ان کا کام صرف دوسروں کو حقیر جاننا ہے۔ان کے نزدیک تمام لوگ غلط ہیں اور صرف وہی ٹھیک ہیں۔یہاں کسی کو بھی ناموس رسالت کیس میں پھنسا کر جیل بھیجا جا سکتا ہے۔ان معاشروں اور ممالک میں سارا زور الہامی سچائی پر ہے، تحقیقی اور عملی تعلیم کا یہاں شدید فقدان ہے۔سچائی کو تلاش کرنے سے ہم ہچکچاتے ہیں۔ہمارے ہاں ساری سچائی تھیوریوں میں پنہاں ہے۔۹/۱۱ سے لے کر ائیر بلیو کے طیارے کا کریش ہو یا پھر کرکٹ میچ کی فکسنگ

اور سیلاب کا ذکر ہو، ہمیں ہر جگہ کسی نہ کسی طریقے سے سازش نظر آ جاتی ہے۔

حال ہی میں 'نیوز لائن' کی طرف سے کرائے گئے سروے کے مطابق ۵ فیصد نوجوان غیر سیکولر ریاست کے حامی ہیں۔ آپ جس کسی بھی ادارے میں چلے جائیں آپ کو آدھے سے زیادہ طلبا ایسے ملیں گے جو سخت مذہبی نظریات کے حامل ہوں گے۔ نظریاتی طور پر تیار کردہ یہ لوگ تمام دنیا کو صرف اپنی عینک سے دیکھتے ہیں۔ ہماری قومی ترجیحات میں عقلی اور سائنسی علوم کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ نفرت، عدم برداشت، دشمنیاں، قتل اور تباہی ایسے بیج ہیں جو بو کر ہم صرف اپنی سوسائٹی کو توڑ پھوڑ رہے ہیں بلکہ اس کے نتیجہ میں ریاست کو بھی تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔

سائنسی علوم کی پیاس، برداشت، مل جل کر رہنے کا سلیقہ اور تمام انسانیت سے پیار (قطع نظر اس کے مذہب کے) ترقی یافتہ، پُرامن اور خوشحال معاشروں اور مستحکم ریاستوں کی وہ بنیادی خصوصیات ہیں جن سے ہم ابھی کوسوں دور ہیں۔ اگر ہم اسرائیلی ماؤں اور مسلم ممالک کی ماؤں کا موازنہ کریں تو دوسرے معاشروں میں مائیں مستقبل کی نسل تیار کرتی ہیں جب کہ ہماری مائیں اپنی سوسائٹی میں بھی بنیادی انسانی حقوق حاصل نہیں کر پاتیں۔ ایک مسلمان خاندان مرد کی حاکمیت پر چلتا ہے جس کی بعض اوقات ایک سے زائد بیویاں ہوتی ہیں اور اُسے بچوں کی نگہداشت میں کم ہی دلچسپی ہوتی ہے۔

صومالیہ کی ہی مثال لے لیجیے جہاں کی آبادی بھوک سے مر رہی ہے۔ یہاں آپ کو خواتین ہی بھوک سے بلکتے بیمار بچے پکڑے نظر آئیں گی۔ اس تصویر میں آپ کو کوئی مرد نظر نہیں آئے گا۔ اگر ہم پاکستانی معاشرے پر نظر ڈالیں تو ہمارا معاشرہ اخلاقیات، عزم اور پیداواری صلاحیتوں سے عاری نظر آتا ہے۔ ہر بندہ کامیابی اور دولت کی تلاش میں شارٹ کٹ ڈھونڈتا پھرتا ہے اس لیے ہر طرف بدعنوانی نظر آتی ہے۔ ہمارے ہاں حلال پروڈکٹ اور حلال چکن پر تو زور دیا جاتا ہے لیکن ایمانداری سے کمائی جانے والی 'روزی' کا تصور ناپید ہوتا جا رہا ہے۔

ہم چین کو اپنا دوست سمجھتے ہیں جس کے ساتھ تجارت سے ہماری صنعت بند ہو چکی ہے۔ ہم امریکہ کو ہر برائی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں لیکن اس کی مالی اور عملی امداد کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ جسے ہم دشمن گردانتے ہیں وہ ہماری تعلیم، صحت، صفائی، سیوریج، مواصلات کے پلان اور پھر عمل درآمد کے لیے فنڈ دیتے ہیں۔ وہ جو فنڈ دیتے ہیں اور دوائیاں مہیا کرتے ہیں کہ یہاں اپاہج پیدا نہ ہوں، بیماریوں کا خاتمہ ہو، مائیں صحت مند رہیں، خواندگی میں اضافہ ہو، ٹیکنیکل تعلیم ہو، لیکن ہم اور ہمارا میڈیا چن چن کر ان کی خامیاں بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔ اور عرب شیوخ جو کھجوروں کے ٹرک، افطاری کے سامان اور

عیدالاضحیٰ پر بکروں کے لیے فنڈز بھیجتے ہیں ان سے محبت اور دوستی کا موازنہ ہم سمندر کی گہرائی اور آسمان کی وسعت سے کرتے ہیں۔

اگر مذہبی تبلیغ کا موازنہ کیا جائے تو عیسائی اور یہودی مبلغ، امن، محبت، بقائے باہمی اور غور وفکر کا درس دیتے ہیں لیکن ہمارے اسلامی مبلغ کا درس قتل وغارت گری اور ناموس رسالت کے گرد گھومتا ہے۔ اسلام کا مطلب امن ہے لیکن مسجد سے پیغام اس بات کا دیا جاتا ہے کہ ہر مخالف کو دبوچ لو۔ جب تک ہم سعودی برانڈ کے حامل متشدد اسلام سے چھٹکارا حاصل نہیں کر لیتے اور پاکستان میں ایک سیکولر اور جمہوری حکومت نہیں قائم کر لیتے اس وقت تک معاشی اور سماجی طور پر خودکشی کے راستے پر گامزن رہیں گے۔ (ماہنامہ نیا زمانہ، لاہور)

استفسارات ڈاکٹر محمد امین

کیا آپ کو مغرب فوبیا ہو گیا ہے؟

سوال: جب سے البرہان کا مطالعہ شروع کیا ہے، ایسا پتہ چلتا ہے کہ جیسے آپ کو مغرب فوبیا ہو گیا ہے کہ حیلے بہانے ہر بات میں مغرب کی مخالفت کرتے ہیں اور بہر طور مغربی فکر و تہذیب میں کیڑے نکالتے ہیں۔ اگر یہ تہذیب اتنی ہی بری ہے اور اس میں کوئی اچھا پہلو نہیں ہے تو یہ دنیا پر غالب کیسے ہے؟ اس لیے انصاف اور اعتدال کا تقاضا یہ ہے کہ آپ مغرب تہذیب کی اچھی باتوں کی تعریف کریں اور بُری باتوں کو رڈ کریں۔ ویسے بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ مسلمانوں سمیت ساری دنیا مغربی علوم وفنون اور سائنس وٹیکنالوجی سے استفادہ کر رہی ہے تو مغرب کی یہ اندھی مخالفت چہ معنی و چہ وزن دارد؟

جواب: ہم مغربی تہذیب کی بعض خوبیوں اور حاصلات کا انکار نہیں کرتے اور نہ اس سے محتاط اور بقیود استفادہ حرام سمجھتے ہیں لیکن یہ صحیح ہے کہ ہم بالعموم اس کی مخالفت کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ

مسلمان اسے ردّ کر دیں اور قبول نہ کریں کیونکہ ہماری سوچی سمجھی اور محکم رائے ہے کہ اسے قبول کرنا اور اس کی اتباع کرنا مسلمانوں کی دنیا اور آخرت دونوں کے لیے تباہ کن ہے۔ ہمارے اس موقف کے دلائل بالاختصار یہ ہیں:

۱۔ مغربی تہذیب کی فکری اساسات بنیادی طور پر ملحدانہ ہیں۔ ان میں عیسائیت کے اثرات کم اور ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور لبرلزم...... وغیرہ کے اثرات زیادہ ہیں جن کا خلاصہ ہے انسان کو خدا سمجھنا، آخرت سے صرفِ نظر اور دنیا پرستی اور وحی وہدایت الٰہی کا انکار۔

۲۔ فطری اور منطقی طور پر مغرب کی ساری تہذیب، اس کے سارے علوم وفنون، اس تہذیب کے پیروؤں کے سارے نظام حیات پر انہی ملحدانہ افکار کی چھاپ ہے، وہ اسی درخت کی شاخیں اور پھل ہیں اور ان میں یہی ملحدانہ روح سرایت کیے ہوئے ہے۔

۳۔ یہ افکار عین کفر ہیں اور ان کا اسلام مخالف ہونا ظاہر و باہر ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کا اسلام پر قائم رہتے ہوئے ان افکار کو تسلیم کرنا یا ان افکار پر مبنی طرزِ حیات اپنانا یا ان افکار پر مبنی علوم وفنون کو بجنسہٖ قبول کرنا ناقابل تصور ہے۔

۴۔ قرآن وسنت کی واضح نصوص موجود ہیں کہ یہود ونصاریٰ مسلمانوں کے اور ان کے دین کے دشمن ہیں اور ان سے دوستی، ان پر اعتماد اور ان کی پیروی جائز نہیں۔

۵۔ مسلمان جب اپنے دین سے عدم وابستگی اور اس کے تقاضوں پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے کمزور ہوئے اور اہل مغرب اپنی تہذیب اور اپنے اصول حیات سے وابستگی کی وجہ سے طاقتور ہوئے تو انہوں نے مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیں، ان کو باہم لڑایا، کمزور کیا، ان پر غلبہ پایا، ان کو قوت سے کچل ڈالا، ان کا مال واسباب لوٹ لیا، ان کے ادارے تباہ کر دیے اور ان کو ہمیشہ غلام رکھنے کے لیے اپنی فکر وتہذیب پر مبنی نظام حیات (نظام تعلیم، نظام معیشت، نظام قانون، نظام عدالت...... وغیرہ) مسلم معاشروں میں جاری ونافذ کیا۔

۶۔ اور جب انہیں مجبوراً مسلمان ملکوں کو کچھ آزادی دینا پڑی تو انہوں نے امن کا لبادہ اوڑھ کر اپنی اسلام اور مسلم دشمن استعمارانہ کاروائیاں جاری رکھیں۔ اپنی معاشی قوت اور سیاسی اثر ورسوخ سے انہوں نے مسلم ممالک میں اقتدار ہمیشہ ان لوگوں کے پاس رکھنے کے لیے کامیاب سازشیں کیں جو ان کی پالیسیاں نافذ کرنے اور ان کے اشاروں پر چلنے والے تھے۔ اہل مغرب نے اسلام کی علم بردار قوتوں کو ناکام بنانے، اسلامی ادارے قائم نہ ہونے دینے اور ہو جائیں تو انہیں غیر موثر بنانے، مسلمان ممالک کی

معیشت کو کمزور کرنے، انہیں اعلیٰ ٹیکنالوجی میں خودکفیل نہ ہونے دینے اور مسلمان معاشروں میں مغربی طرزِ زندگی رائج و نافذ کرنے کے لیے ہر حیلہ اور ہر طریقہ اختیار کرنے کی پالیسی اپنائی اور اس میں خاصی کامیابی حاصل کی۔

۷۔ لیکن ان ساری کوششوں کے باوجود بعض مسلمان ممالک مضبوط ہوگئے اور انہوں نے سر اٹھانا شروع کیا تو اہلِ مغرب دوبارہ ننگی جارحیت پر اتر آئے اور انہوں نے متحد ہو کر (اس سے پہلے انہوں نے متحد ہو کر ہی صلیبی جنگیں لڑی تھیں اور مسلمانوں کو غلام بنایا تھا...... اور اس کے برعکس مسلمانوں میں خلافت ختم کی اور عالم اسلام کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا اور ان کے اتحاد کو موثر نہ ہونے دینے کے لیے آج بھی مغرب کامیاب سازشیں کر رہا ہے) پہلے عراق کو روندا، پھر افغانستان کا تورا بورا بنایا، لیبیا میں قتلِ عام کیا اور اب پاکستان پر حملے ہو رہے ہیں، شام لپیٹ میں ہے اور ایران پر دباؤ جاری ہے۔

تہذیبی حملے اس پر مستزاد ہیں۔ امریکہ نے جعلی قرآن چھاپ دیا ہے، رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کارٹون بنائے جاتے ہیں، جہاد کی آیات نصابات سے نکلوائی جا رہی ہیں۔ میڈیا کے ذریعے فحاشی اور عریانی پھیلائی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کی آبادی کم کرنے کے لیے برتھ کنٹرول کے آلات مفت سپلائی کیے جاتے ہیں...... غرض مسلم معاشرے میں مغربی فکر و تہذیب اور مغربی طرزِ زندگی پھیلانے اور مسلمانوں کو اپنے دین اور اپنے اصول و اقدار سے برگشتہ کرنے کے لیے سارے پرامن اور سارے جارحانہ نسخے آزمائے جا رہے ہیں۔

۸۔ کیا اس سب کے باوجود ہم عقل کے اندھوں کو یہ ماننے میں تامل ہے کہ ملحدانہ مغربی فکر و تہذیب کا علم بردار مغرب اسلام اور مسلمانوں کا دشمن ہے؟

۹۔ ہمارے نزدیک یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہے کہ اہلِ مغرب یہ سب کچھ اس لیے کر رہے ہیں کہ مسلمان اپنے دین سے دور رہیں۔ کمزور و ناتواں رہیں اور زوال سے نکل نہ سکیں بلکہ ان کی تہذیب کو اپنائے رہیں اور ان کے غلام رہیں اور یوں دنیا میں ذلیل و رسوا اور آخرت میں خائب و خاسر رہیں۔

۱۰۔ ان حالات میں مغرب کی ہر طرح کی مزاحمت واجب ہے کہ اسلام میں جہاد کا تصور یہی ہے؟ ہمارے ہاتھ میں چونکہ قلم ہے اس لیے ہم مغرب کی مزاحمت قلمی جہاد سمجھ کر کر رہے ہیں اور جب تک یہ قلم ہمارے ہاتھ میں ہے، ہم یہ علمی اور فکری مزاحمت کرتے رہیں گے کیونکہ ہمیں کافر مغرب کی غلامی قبول نہیں ہے خواہ وہ ذہنی ہو یا جسمانی۔ و تلک عشرۃ کاملۃ۔

تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری کتابیں خصوصاً 'اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش' جو مکتبہ البرہان سے دستیاب ہے۔

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زرِاعانت سالانہ 400 روپے تاحیات 5000 روپے

نام.. پتہ..

فون..

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-71 فیصل ٹاؤن، لاہور بھجوائیے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ھیں

استفسارات

خلیفہ اور خلافت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟

سوال: البرہان اپریل ۲۰۱۲ء میں آپ نے سردار عالم خاں صاحب کے اس نقطۂ نظر کو غلط ٹھہرایا کہ ہر مسلمان زمین میں اللہ کا خلیفہ ہوتا ہے لیکن اس کی تصحیح نہیں کی اور یہ نہیں بتایا کہ آپ کے نزدیک خلیفہ اور خلافت کا صحیح تصور کیا ہے؟

جواب: دیکھیے! بنیادی چیز ہے ورلڈ ویو یعنی آپ کا تصور انسان، تصور الٰہ اور تصور کائنات کیا ہے؟ ہمارے ہاں جو شعبہ ان سوالات کا جواب دیتا ہے ہم اسے 'عقیدہ' کہتے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ اس کائنات کی بنیادی ترین حقیقت ہے، وہ خالق ہے، رازق ہے، مالک ہے، رب، رحمن، رحیم، حی و قیوم، زندگی اور موت دینے والا، ہمارے نفع نقصان پر قادر اور ہماری تقدیر کا مالک ہے......وغیرہ وغیرہ (یعنی ذات باری کی وہ ساری صفات جن کا قرآن وسنت میں موجود ہے) اور انسان اللہ کا عبد ہے یعنی اللہ جتنا بڑا، عظیم، مقتدر، عزیز، جبار، مہیمن، حی و قیوم ہے انسان اس کے مقابلے میں حقیر

ترین ہے ذرۂ ناچیز، بندہ بے دام، نوکر، خادم، غلام اور پستی، ذلت، حقارت اور لاشی ہونے کے جتنے الفاظ ہماری زبان میں مستعمل ہیں، وہ جمع کر دیئے جائیں تو بھی انسان کی عبدیت کا حق ادا نہیں کرتے۔ اور اسلام کا تصور کائنات یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو اس کائنات میں بطور امتحان بھیجا ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک کی مرضی اور حکم کے مطابق دنیا کی زندگی گزارتا ہے یا نہیں؟ اگر گزارے گا تو موجودہ چند سالہ ناپائیدار زندگی گزارنے کے بعد جب ہمیشہ کی زندگی میں جائے گا تو وہاں اللہ کی خوشنودی اور نعمتوں کا مستحق ٹھہرے گا اور اگر دنیا کی موجودہ زندگی اللہ کے احکام کی خلاف ورزی میں گزارے گا تو اس کی نافرمانی اور عذاب کا مستحق ٹھہرے گا۔

مندرجہ بالا وضاحت سے نمایاں ہو گیا کہ انسان کا اس دنیا میں بنیادی کردار عبد کا ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے خالق و مالک کی عبادت وطاعت میں لگا رہے[۱] لیکن اللہ کی 'عبد' تو اس کی دوسری مخلوق بھی ہے۔ فرشتے بھی اس کے 'عبد' ہیں اور حیوانات و نباتات بھی بلکہ اس کی ساری مخلوق سورج، چاند، پہاڑ، دریا ہر چیز اس کی 'عبد' ہے تو انسان اور ان دوسری مخلوقات کے عبد ہونے میں کیا فرق ہے؟ فرق یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو عبد ہونے کے ساتھ 'خلیفہ' بھی بنایا ہے۔ خلیفہ عربی میں اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کے بعد آئے اور اس کے اختیارات

۱۔ الذاریات ۵۱:۵۶

استعمال کرے[۱] اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تو اسے عبدیت کے ساتھ دو بنیادی نوعیت کے اختیارات (پاور، اتھارٹی، آپشن بھی دیے) ایک تو یہ کہ وہ چاہے تو 'حق'، 'اسلام' یا اسلامک ورلڈ ویو' کو قبول کرے اور چاہے تو نہ کرے یعنی چاہے تو اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے اور چاہے تو اپنی اور شیطان کی مرضی کے مطابق۔ دوسرے یہ کہ ساری کائنات انسان کے تابع اور مسخر کر دی یعنی وہ جیسے چاہے اس میں تصرف کرے۔ گویا 'انسان' بحیثیت بنی نوع انسان (بطور Specie)[۲] زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے خواہ وہ کافر ہو یا مسلمان، اللہ کو مانے یا نہ مانے۔

انسان کو چونکہ اللہ نے مدنی الطبع پیدا کیا ہے اور قیامت تک کے لیے اسے مہلت عمل دی ہے لہٰذا انسان اس دنیا میں خاندان، قبیلے، برادری، معاشرہ اور ریاست کی صورت میں اجتماعی زندگی منظم انداز میں گزارتا ہے۔ ریاست کا سربراہ بھی ان معنوں میں اللہ کا خلیفہ ہوتا ہے کہ اسے اجتماعی زندگی کو منظم کرنے کی قوت و اختیار حاصل ہوتا ہے اور بحیثیت انسان یہ آپشن بھی کہ وہ چاہے تو اس وقوت و اختیار کو اللہ کی مرضی کے مطابق استعمال کرے یا چاہے تو اپنی اور شیطان کی مرضی کے مطابق چنانچہ قرآن مجید میں حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے خلیفہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے[۳]

اگر انسان اس اختیار کو صحیح استعمال کرے اور خیر کو اختیار کرے (۴) یعنی اپنی مرضی اپنے خالق و مالک ورازق والہ کی مرضی کے تابع کر دے اور بلا شرط وقید اس کی عبادت وطاعت کا فیصلہ کرے تو اس کا یہ رویہ 'اسلام' کہلاتا ہے اور جو شخص یہ رویہ اختیار کرے وہ 'مسلم' کہلاتا ہے لہٰذا مسلمان کو عبد کہنا زیادہ موزوں اور مناسب ہے کیونکہ اس کا بنیادی وظیفہ اور کردار عبد کا ہے اور وہ ایسا عبد ہے جو بحیثیت انسان حاصل ہونے والے خلیفہ کے اختیارات کو بھی اپنی عبدیت کے تابع رکھتا ہے، بحیثیت ایک عام فرد کے اور اگر اجتماعی زندگی میں اسے قوت واختیار مل جائے تو پھر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک شخص نے حضرت ابوبکرؓ کو ''یا خلیفۃ اللہ'! کہہ کر پکارا تو آپ نے اسے ٹوک کر اس کی تصحیح کی کہ میں 'خلیفۃ اللہ' نہیں 'خلیفہ الرسولؐ

ا۔ ابن منظور، لسان العرب، ۱۹۰۳/، دارالحدیث القاہرہ ۱۴۲۳ھ

۲۔ قرآن حکیم سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اختیارات انسانوں کے ساتھ جنّوں کو بھی دیے گئے لیکن جن کوئی دوسری نوع کی مخلوق ہے جس کے بارے میں مکمل تفصیلات ہمیں نہیں دی گئیں اور نہ ہمارے پاس انہیں تفصیل سے جاننے کا کوئی دوسرا یقینی ذریعہ موجود ہے۔

۳۔ سورہ ص ۲۶:۳۶

۴۔ یہاں یہ دلچسپ اور لطیف نکتہ بھی سامنے رہے کہ عربی لغت کی رو سے اختیار کا مادہ بھی خیر ہے گویا اختیار کا مطلب ہے اختیارِ خیر یعنی منطقی اور فطری انداز یہ ہونا چاہیے کہ انسان جب اس اختیار کو استعمال کرے تو وہ خیر کا انتخاب کرے یعنی اللہ کی عبادت واطاعت کا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کرے۔

ہوں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب اور جانشین ہوں (گویا اپنے اختیارات کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے اور آپؐ کی متابعت میں استعمال کرنے والا ہوں) (۱)۔ حضرت ابوبکرؓ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو لوگ آپ کو 'خلیفۃ خلیفۃ رسول اللہؐ' کہتے تھے یعنی رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ کا خلیفہ۔ یہ طرز تخاطب یا جملہ حضرت عمرؓ کے ادبی ذوق پر گراں گزرتا اور آپؐ نے صحابہؓ سے کہا کہ ہر آنے والے کے ساتھ تم لوگ اگر خلیفہ کے لفظ کا اضافہ کرتے رہو گے تو یہ مضحکہ خیز ہو جائے گا یعنی خلیفۃ خلیفۃ خلیفۃ رسول اللہ لہٰذا یہ تعبیر صحیح نہیں اس کا کوئی اور حل سوچا جائے۔ چنانچہ مشاورت کے بعد، جس میں کئی القابات زیر غور آئے 'امیر المومنین' کا لقب حضرت عمرؓ کو پسند آیا اور آئندہ وہی استعمال ہونے لگا (۲) لیکن خلیفہ اور خلافت کا لفظ بھی متروک نہیں ہوا لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کے معنوں میں۔ چنانچہ مشہور مسلمان سیاسی مفکر الماوردی نے خلافت کی تعریف نیابۃ عن الرسول کے حوالے ہی سے کی ہے۔ **'الامامة موضوعة لخلافة النبوة فی حراسة الدین وسیاسة الدنیا'** (۳)۔ یعنی مسلم حکمران نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ ہوتا ہے۔

اگرچہ یہ بھی ایک معروف حقیقت ہے کہ بعد میں مسلم نظام حکومت میرٹ کی بجائے وراثت میں تبدیل ہوگیا، شورائیت کی روح اس میں سے کم ہوتی چلی گئی اور شخصی استبداد کا عنصر بڑھ گیا، بیت المال کی دولت بھی حکمرانوں کی ذاتی ہوا و ہوس کے لیے استعمال ہونے لگی اور بہت سے مسلم سلاطین وملوک نے 'ایک مسلم حکومت' سے باہر اپنی آزاد اور خودمختار سلطنتیں بھی قائم کرلیں اور سلطان، ملک، بادشاہ، بلکہ شہنشاہ جیسے القابات بھی اختیار کرلیے۔ بایں ہمہ لفظ 'خلافت' بھی بطور ایک سیاسی روایت کے باقی رہا خصوصاً مسلمانوں کی اجتماعیت اور اتحاد کی علامت کے طور پر اور مرور زمانہ سے اسے ایک گونہ تقدس بھی حاصل ہوگیا۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ خود مسلم روایت میں لفظ خلیفہ سیاسی اقتدار و جانشینی کے علاوہ دوسرے معنوں میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے چنانچہ صوفی بزرگ رمرشد رمربی کے نائب کو بھی خلیفہ کہتے ہیں۔عربی زبان میں یہ آج بھی اپنے لغوی معنوں میں بلاتکلف استعمال ہوتا ہے۔انگریزوں نے جب برصغیر پر قبضہ کرلیا تو مسلمانوں کو ذلیل کرنے اور ان کی روایات والقابات کو پامال کرنے کے لیے حجاموں کو خلیفہ کہنا شروع کردیا اور دفتروں کے چپراسیوں اور چھوٹے ملازمین کو وہ پگ اور شملہ پہننے کا حکم دیا جو مسلمان نواب وحکمران اور علماء وزعماء پہنتے تھے۔

۱۔ ابن خلدون، المقدمہ، فصل ۲۶،ص ۱۵۹

۲۔ ابن خلدون، المقدمہ، فصل ۳۲،ص ۱۸۹

۳۔ الماوردی: الاحکام السلطانیۃ، ص ۳، مطبعۃ الوطن بمصر ۱۲۹۸ھ

آج مسلمانوں کی جو جماعتیں بحالیٔ خلافت کا نعرہ لگاتی ہیں غالباً ان کے پیش نظر یہ ہوتا ہے کہ ساری مسلم امت سیاسی طور پر متحد ہوجائے اور ان کا حکمران ایک ہو اور مسلم سیاسی نظام شریعت اسلامی کے مطابق ہو، ورنہ ظاہر ہے تمدنی اوضاع کی تبدیلی کے بعد نہ اب خلافت راشدہ کا نظام اپنی ظاہری شکل میں آج نافذ ہوسکتا ہے (اور نہ ان ظواہر کی پابندی غالباً شریعت میں مطلوب ہے) اور نہ دور متاخرین کی 'خلافت' کی پیروی کرنا، تقاضائے شریعت ہے کیونکہ اس 'خلافت' میں بہت سی باتیں خلاف شریعت تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی جدید دینی سیاسی تحریکیں (جیسے مشرق وسطی میں الاخوان المسلمون اور برصغیر میں جماعت اسلامی وغیرہ) بحالیٔ خلافت کا نعرہ نہیں لگاتیں اور اسلام کے سیاسی نظام کی بحالی کے لیے کوشاں ہیں......اور اس میں کوئی ہرج بھی نہیں۔

اسلام کے سیاسی نظام کا ایک بنیادی ستون مشاورت کا اصول ہے لیکن یہ مشاورت کس سے کی جائے، کب کی جائے اور کس طرح کی جائے؟ یہ باتیں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عمداً طے نہیں فرمائیں کہ یہی تقاضائے عقل وحکمت تھا اور یہ امور امت اور اس کے اہل علم (مجتہدین) پر چھوڑ

دیے تا کہ وہ اپنے حالات اور اپنی ضروریات کے مطابق اس کی تفصیلات طے کرلیں۔

جہاں تک مغربی جمہوریت کا تعلق ہے تو وہ بنیادی طور پر اسلام کے سیاسی نظام سے بالکل مختلف اور متضاد نظام ہے کیونکہ نہ وہ اللہ کی کبریائی کو مانتا ہے اور نہ انسان کی عبدیت کو بلکہ وہاں ہیومنزم کی رو سے فرد خود خدا ہے اور سیکولرازم کی رو سے اللہ کو سیاسی اور دوسرے اجتماعی شعبوں میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ کیپٹل ازم کی رو سے دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے آخرت کچھ نہیں لہٰذا مغرب کی بنیادی فکر ہی اسلام سے مختلف اور متضاد ہے۔ سیاسی نظام کی تفصیلات و فروعات میں اگرچہ کچھ چیزیں دونوں نظاموں میں مشترک ہوسکتی ہیں جیسے حکومت سازی کے لیے عوام سے مشاورت اور رائے لینا تو وہاں بھی مسلمانوں کو اپنے مقامی حالات اور اپنی دینی و سیاسی روایات کے مطابق اپنے ادارے بنانے چاہئیں تاہم بطور انسانی اور سیاسی تجربے کے مغرب کے اداروں کو سامنے رکھنے یا ان سے محتاط استفادہ کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ آنکھیں بند کرکے سو فیصد ان کی نقالی نہ شروع کردی جائے۔

امید ہے خلیفہ اور خلافت کے تصور کے حوالے سے بات کچھ واضح ہوگئی ہوگی تاہم اگر آپ کے ذہن میں مزید اشکالات ہوں تو بلا تکلف ہم سے رابطہ کیجیے۔

بزمِ قارئین

آفتاب عروج (چنیوٹ)　　**موضوع:** اسلام اور سائنس

عرض یہ ہے کہ آپ کی خدمت میں ماہنامہ 'نیا زمانہ' لاہور کے ایک مضمون 'سائنس اور ہماری ترجیحات' کی فوٹو کاپی ارسال خدمت ہے یہ اس لیے کہ (بصد معذرت) تقریباً آپ کی ہر تحریر میں یہ جملہ بہ تکرار موجود ہوتا ہے کہ......ہم نے مرعوب نہیں ہونا......اس بندۂ ناچیز کے ناقص علم کے مطابق کسی سے مرعوب نہ ہونے کے لیے اہلیت و صلاحیت کے ساتھ ساتھ خود اعتمادی کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو ہم میں نہیں ہے، بالکل نہیں ہے۔ حکومتوں کی مجرمانہ غفلت کو تو چھوڑیے کہ یہ بے دین لوگ ہیں (باوجود اس بات کے کہ دینی قوتیں ہر حکومت کا حصہ رہتی ہیں اور اس سے مستفید بھی ہوتی رہتی ہیں) دینی قوتوں نے

حکومتی دائرے سے باہر ایک الگ تعلیمی نظام تشکیل دے رکھا ہے۔فرقہ پرستی کی علامت کے طور پر ان کے پانچ وفاق ہیں جن میں سے ہر سال کم از کم چالیس پچاس ہزار غیر ہنر مند افراد کی ایسی کھیپ تیار کی جا رہی ہے جو ملکی اور بین الاقوامی حالات و واقعات سے بالکل نابلد ہوتے ہیں اور وہ خود اپنے خاندان اور معاشرے پر ایک بوجھ کی حیثیت رکھتے ہیں۔معاشرہ میں ان کا کوئی مثبت، تخلیقی اور تعمیری کردار نہیں ہے اور کہہ ہم یہ رہے ہیں کہ......ہم نے کسی سے مرعوب نہیں ہونا!

اے اجل ان سے مل......کہ یہ سادہ دل......نہ اہل مشین......نہ اہل یقین......

فقط بے یقین......اے اجل ان سے مل

مذکورہ مضمون کی فوٹو کاپی ارسال کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہودیوں اور مسلم امہ کا تقابلی جائزہ لے کر ہم اس آئینہ میں اپنا چہرہ اور مقام و مرتبہ دیکھ سکیں۔آپ ایک نہایت ہی مخلص دانشور ہیں اور کچھ کر گزرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں لیکن آپ کی قدامت پرستانہ سوچ آڑے آ رہی ہے۔آپ ایک ایسے پرندے کی مانند ہیں جس کے سامنے اس پنجرے کا دروازہ کھلا ہے جس میں وہ برسوں قید رہا ہے لیکن برسوں قید رہنے کی وجہ سے اس پنجرے سے انسیت وطمانیت پیدا ہو جانے کی وجہ سے ایک انجانا خوف اسے آزاد فضا میں جانے سے روکے ہوئے ہے کہ مبادا کوئی مجھے اچک کر نہ لے جائے۔

البرہان اپریل ۲۰۱۲ء کے شمارہ میں آپ نے میرے دس صفحات پر مشتمل عریضہ کو قتل کر کے پھر اس کا قیمہ بنا کر البرہان کی دس سطروں پر چپکا دیا۔کیا یہی صحافتی انصاف ہے؟ آپ نے مجھ ناچیز پر الزامی طور پر ایک جملہ فرمایا ہے کہ یہ......اہل قرآن جیسی فکر کے حامل ہیں......اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائیں یہ بندۂ ناچیز آپ کے اس الزامی جملہ کا اقرار کرتا ہے۔اللہ تبارک تعالیٰ نے تمام دنیا پر صرف اور صرف قرآن ہی فرض کیا ہے۔سورۃ القصص ۸۵،سورۃ الاعراف ۳،سورۃ الزخرف ۴۳، ۴۴ ۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صاحب قرآن تھے اور ان کے تمام ساتھی رضی اللہ تعالیٰ عنہم قرآنی فکر کے حامل تھے۔

عرفان احمد (ایڈیٹر ندائے کسان، لاہور)　　**موضوع:** عمران خان اور نواز شریف

البرھان روز اشاعت سے ہی باقاعدگی سے موصول ہو رہا ہے، بہت اہم اور سنجیدہ موضوعات پر آپ مضامین شائع کر رہے ہیں۔اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔کچھ تلخ باتیں بسلسلہ برھان گوش گزار ہیں، پہلی تو یہ کہ......

آپ نے اہم ترین مضامین قسط وار شائع کر کے ان کی افادیت ختم کر دی ہے، اس کا مجھے از حد

افسوس ہے، زاہد صدیق صاحب، خالد جامعی صاحب، ڈاکٹر عبدالوہاب صاحب کے مضامین بہت عمدہ اور معیاری تھے لیکن قسط وار ہونے کی وجہ سے کچھ پلے نہیں پڑا۔ ایک ماہ بعد تو ڈائجسٹ بھی ناول یا کہانی کی گزشتہ اقساط کا خلاصہ شائع کرتے ہیں اور سنجیدہ موضوعات کو یاد رکھنا مشکل ترین ہوتا ہے اس لیے میری تجویز ہے کہ آپ دیگر قارئین سے اس بارے میں رائے لیں اور اس کے بعد کوئی فیصلہ فرمائیں ممکن ہو تو ایک خصوصی نمبر مغرب اس کی فکر اور درپیش چیلنجز کے بارے میں شائع کر دیں۔

دوسرا اہم ترین ایشو جس کے متعلق میں گزشتہ کئی مہینوں سے آپ تک اپنی رائے پہنچانا چاہ رہا تھا وہ عمران خان اور تحریک انصاف کا ایشو ہے۔ ملک احمد سرور صاحب نے عمران خان کے بارے میں اپنا موقف بذریعہ خط واضح کر دیا ہے، اس پر مزید گفت گو کی ضرورت نہیں۔ عمران خان نہ تو کوئی انقلابی لیڈر ہے نہ اسلامی انقلاب کا نمائندہ، اس لیے ایسے امور کی اس سے زیادہ توقع کرنا خام خیالی ہے۔ یہ الگ بحث ہے کہ جمہوری طریق کار اور جاگیردارانہ سرمایہ دارانہ معاشرہ میں جمہوریت کے ذریعے کیا کوئی انقلاب یا حقیقی تبدیلی لانا ممکن ہے؟ تاہم ملک کو درپیش موجودہ مسائل کے حوالے سے اس بات کا تعین کرنا بہت ضروری ہے کہ ہمیں جو مسائل درپیش ہیں ان کا ذمہ دار کون ہے؟ اگر ذمہ دار لوگوں کا تعین پرانے تعصّبات کو ایک طرف رکھتے ہوئے، کیا جائے تو مسئلہ سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی اور یہ بات واضح ہو جائے گی کہ سٹیٹس کو کے حامیوں کو دوبارہ ووٹ ڈالنا چاہیے یا نہیں۔

اس وقت ملک کو بے شمار مسائل کا سامنا ہے جن میں کرپشن جیسے پیچیدہ، لاقانونیت، انصاف کا دہرا معیار، اداروں کی تباہی و بربادی جیسے مسائل شامل ہیں۔ ان مسائل کی ابتدا کیسے ہوئی، کن لوگوں نے کرپشن کی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے، اس کی سرپرستی کن لوگوں نے کی اور اس کلچر کو پروان چڑھایا؟ اس حقیقت سے ہم سب واقف ہیں کہ اس ملک میں کرپشن اور تباہی کا کلچر ہمارے نام نہاد جمہوری دور (۱۹۸۵ء) سے شروع ہوا ہے۔ اس میں ہر آنے والے حکمران نے اضافہ کیا بلکہ قرضوں کا بوجھ ہر دور کے بعد آنے والے دور میں اس سے دگنا ہوا ہے۔ لوٹ مار جو چھپ چھپا کر ہوتی تھی اب معاشرے کا جز ولاینفک بن گئی ہے اور اوپر سے نیچے تک سرائت کر چکی ہے۔ جمہوری اداروں کے ادنیٰ ترین کارندے یعنی کونسلر سے لے کر وزیر اعظم تک کرپشن میں لتھڑے ہیں۔ اگر کوئی تحقیق کرنے والا اس بات کا گاؤں گاؤں اور محلہ کی سطح تک جا کر جائزہ لے لے کہ معاشرے کے کس طرح کے لوگ بنیادی جمہوریتوں میں کونسلر کے لیے اپنے آپ کو عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں پھر اسے ٹھیکے داری نظام کے ذریعے قابو رکھتے ہیں۔ ٹھیکے داری کے اس کلچر نے اوپر سے نیچے تک سب کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ ٹھیکے داران لوگوں پر سرمایہ کاری کرتے ہیں اور سرمایہ دار اپنے مہروں کو بساط سیاست پر آگے بڑھاتے

ہیں۔امریکہ کے صدارتی الیکشن سے لے کر پاکستان کے کونسلروں تک سرمایہ داری کے منفعت زدہ اور معاشرے کے کرپٹ ترین لوگ جمہوری ملکوں کے ذریعے اداروں پر مسلط ہوتے ہیں اور ان اداروں کو تباہی کے دہانے پر پہنچا کر دم لیتے ہیں۔محکمہ تعلیم،صحت اور مال اس کی مثالیں ہیں۔کیا یہ محکمے اور ادارے واقعی وہ کردار ادا کر رہے ہیں جو ان کا ہونا چاہیے۔ ہرگز نہیں،لیکن ذرائع ابلاغ میں تو اب جمہوریت کو دین وایمان کا درجہ حاصل ہے۔

اس ملک میں سیاسی رشوت، ہارس ٹریڈنگ، نااہل اور کرپٹ لوگوں کی کوٹے کی بنیاد پر محکمہ پولیس،تعلیم اور مال میں تقرریاں کس نے کیں؟ کس نے ان اداروں کی بنیادوں کو کھوکھلا کیا ہے؟ اگر نواز شریف کے علاوہ کوئی اور سیاست دان اس کا ذمہ دار ہے تو اس پر کھل کر لکھیے۔ پھر عرفان صدیقی صاحب یا عطاء الحق قاسمی صاحب کو دعوت دینی چاہیے کہ وہ اس پر قلم اٹھائیں۔ 1983 سے 1999ء تک سرمایہ داروں کے نمائندے ملک کے سب سے بڑے صوبے پر مسلط رہے ہیں۔قوم کو 16 سالوں کا حساب دیں۔انہوں نے اس صوبے کے لیے کیا کیا ہے؟ ان 16 سالوں میں انہوں نے عوام کو کیا ڈلیور کیا ہے؟ عدلیہ کے ساتھ محاذ آرائی بلکہ عدلیہ کی تذلیل کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ججوں،صحافیوں، جرنیلوں اور انتظامیہ کی خرید وفروخت اور چھانگا مانگا، لال سوہانرا اور مری ہل اسٹیشنز کی سیر اور عیاشیوں کے کھلے مواقع اور ان ذرائع سے قابو میں رکھے گئے حریص وڈیرے ان کا دیا گیا اثاثہ ہیں اور پھر ان کو عوام میں پذیرائی نصیب ہوئی تو فرعونیت پر مبنی کلچر جس میں نہ تڑپنے کی اجازت تھی نہ فریاد کرنے کی،صیادوں نے تو صرف گھٹ کر مر جانے کی اجازت دی یا ذہنی مریض بن جانے کی (جاوید ہاشمی کی مثال سامنے ہے) حتیٰ کہ 1999ء میں ایک غلیظ آمر کی آمد پر لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔اس کے بعد کا کردار بھی ہمارے سامنے ہے اس کا ذکر بھی میں کرتا ہوں لیکن یہ سوال ضرور پوچھنا چاہوں گا کہ کیا یہی وہ قابل فخر کلچر اور دفتر اعمال ہے جس کی بنیاد پر لوگ آج آپ جیسے مخلص حضرات کے سامنے ووٹ کے حق دار بن کر کھڑے ہو سکتے ہیں؟ جس کے فروغ کے لیے میاں صاحب نے نج کاری کا رواج شروع کیا اور قومی اداروں کی نج کاری کا آغاز ہوا۔پھر ان کی اونے پونے داموں فروخت کی لوٹ سیل لگائی جو اب عروج پر پہنچتی نظر آتی ہے۔آخر اس سے ملک نے کیا ترقی کا سفر طے کیا ہے؟ موٹروے، سامان کے بھرے صندوقوں اور باورچیوں کی فوج کے ساتھ سرور پیلس میں اور پھر لندن کے فلیٹوں میں قیام اور ملین پونڈز کی سرمایہ کاری کرنے کے بعد میثاق جمہوریت کا کھیل کھیلا گیا اور اس کھیل کے ذریعے پہلے مشرف کے ساتھ بے نظیر بھٹو نے مفاہمت کی اور اس مفاہمت کی آڑ میں موصوف بھی پاکستان پہنچ گئے،اور کبھی بائیکاٹ،کبھی الیکشن اور بالآخر الیکشن غیر متوقع پذیرائی پر حکومت بنائی اور پھر اس حکومت کو بچانے کے لیے زرداری کو صدر بنوانا

اور پھر زرداری نظام کو جمہوریت کی بقا اور نظام کے تحفظ کے نام پر دوام بخشنا۔ سیاست میں کردار کشی اور غلاظت پر مبنی زرد صحافت کا فروغ کے علاوہ ان کے دفتر اعمال میں کچھ ہے تو ضرور سامنے لائیے۔ کیا اس بنیاد پر کہ ہر آنے والا حکمران ظلم وزیادتی کے نئے ریکارڈ قائم کرتا ہے اور پھر قوم پچھلے کفن چور کو یاد کرتی ہے اور اس سنہری دور کو واپس لانے کی کوشش شروع کر دیتی ہے، دوبارہ ان کو برسر اقتدار لے آتی ہے، یہ جو دائروں کا سفر ہم نے 1985ء سے شروع کیا تھا اس کی کوئی منزل بھی ہے یا نہیں؟

یہ تو مشیت الٰہی اور قدرت کا فیصلہ ہے کہ دونوں بدترین خاندان بیک وقت حکمران بن گئے اور ان کی اہلیت کھل کر عیاں ہو گئی۔ ملک تباہی کے دھانے پر کھڑا ہے اور ہمارے دانش ور ابھی تک نوے کی دہائی کی سیاست کا کھیل شروع کرنا چاہ رہے ہیں، یعنی سب لوگ کسی نظریے اور اخلاقی قدروں اور طے شدہ اصولوں کے بغیر صرف زرداری کو ہٹانے کے لیے اکٹھے ہو جائیں۔ معلوم نہیں اس موقع پر میثاق جمہوریت کہاں چلا گیا ہے؟ جب زرداری کو صدر بنوایا گیا تھا تو اس وقت چوہدری شجاعت اور مشرف سے انتقام کی آگ میں اندھے ہو کر زرداری کی صدارت کی راہ ہموار کر دی گئی۔ ان دانش وروں کو چاہیے تھا اپنے سادہ لوح ممدوح کو اس وقت یاد دلاتے کہ زرداری ہرگز قابل اعتماد نہیں۔ اگر امیر مقام، ہمایوں اختر، ماروی میمن جیسوں کو گلے ہی لگانا تھا تو پھر پہلے گلے لگا کر زرداری کا راستہ ہی روک لیتے۔ اب پھر وسیع تر اتحاد کے راگ الاپے جا رہے ہیں۔ قوم اور آپ جیسے مخلص دانش وروں کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ کیا یہ ملک انہی لوگوں کی چراگاہ بنا رہے گا۔ نظریات کے نعرے بلند کیے جائیں اور جب اقتدار حاصل کرنے کا وقت آئے تو اسفند یار ولی، غلام احمد بلور، الطاف حسین جیسوں کو بھی گلے لگا لیا جائے۔

تجھ سے گریز بھی ہے تیری جستجو بھی ہے
تُو پھر کہیں ملے یہ آرزو بھی ہے

دوسری اہم بات میری نظر میں انگریزی ذریعہ تعلیم اور مخلوط تعلیم کے نام پر اس وقت ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کا جو کام خادم اعلیٰ پنجاب نے کر دیا ہے اس کی تلافی تو آئندہ آنے والی کئی دہائیوں میں بھی نہیں ہو سکتی۔ بجا طور پر البرہان کے تازہ شمارے میں ملک محمد حسین صاحب نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ پوری اسلامی دنیا اپنی اصل شناخت کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اتاترک ازم اپنی موت مر گیا، فرعونوں کے جانشین عدالتوں کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر آنسو بہاتے نظر آتے ہیں۔ عالم اسلام گیا دور سرمایہ داری گیا کی عملی تصویر نظر آتا ہے اور یہ لوگ نظریاتی مملکت میں نظریاتی بنیادوں کو منہدم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ملک محمد حسین صاحب بھی کچھ غلط فہمی کا شکار ہیں جو انھوں نے ان کو نظریۂ پاکستان کا علمبردار لکھا ہے۔ نواز شریف نظریۂ پاکستان سے کب کے دستبردار ہو چکے ہیں۔ شاید ملک صاحب محترم کو مسلم لیگ

کے نام سے یہ غلط فہمی لاحق ہوئی کہ ان کا نظریۂ پاکستان سے بھی کوئی تعلق ہے اور میاں صاحب کا یہ فرمان کہ 'ہم بھی اسی خدا کی پوجا کرتے ہیں جس کی ہندو کرتا ہے اور یہ کہ ہمارا ایک ہی طرح کا کلچر اور کھانا پینا ہے' یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کا فکری اور نظریاتی شعور کس طرح کا ہے۔ میاں صاحب ناجی صاحب سے فکری راہ نمائی لیتے رہے ہیں اور وہ ان کے آخری وقتوں کے مقربین میں شامل تھے۔ نذیر ناجی نے نظریہ پاکستان سے اس غداری پر ایک تعریفی کالم بھی لکھ دیا تھا۔

رہی بات شرافت اور اخلاقی قدروں کی تو اس کی گواہی کے لیے حمزہ شہباز شریف ہی کافی ہے۔ ایک اور غلط فہمی یہ بھی ہے کہ بیوروکریسی غلطیاں کروا رہی ہے۔ خادم اعلیٰ موصوف اپنے آپ کو عقل کل خیال کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ آٹا سکیم، دانش سکول، لیپ ٹاپ سکیم اور دیگر عجوبہ روزگار سکیموں کی صورت میں نظر آتا ہے۔

ملک صاحب نے تعلیمی موضوع اور قومی زبان کے ایشو پر قلم اٹھایا ہے، پنجاب کالج اور پرائیویٹ تعلیمی ادارے کس طرح کا منظر اور کلچر پیش کرتے ہیں یہ ملک صاحب بہتر جانتے ہیں۔ کیا پنجاب حکومت کی کوئی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بے حیائی پر مبنی کلچر کی روک تھام کے لیے اپنا کردار ادا کرے اور ذرائع ابلاغ کی جانب سے جو فحاشی پھیلانے کا کام ہو رہا ہے اس کے سامنے سینہ سپر ہو جائے۔ بدقسمتی ہے کہ جب پنجاب کالج کے پروگرام میں لڑکیاں کھلی گئیں تو تعلیمی اداروں میں ثقافتی سرگرمیوں کی اجازت کی بنیاد پر قرارداد کی مخالفت کی گئی اور تینوں بڑی پارٹیاں اسمبلی میں خدا کے فرمان کی بجائے میڈیا کے میراثیوں کے سامنے جھک گئیں اور ہمارے نام نہاد دائیں بازو کے نمک خوار دانش وروں (عرفان صدیقی، عطاالحق قاسمی) کو یہ طوفان بدتمیزی نظر نہیں آتا۔ بے چارے انصار عباسی صاحب خواہ مخواہ شور مچاتے رہتے ہیں۔ اب تو اسلامی قوتوں کے نمائندے اور دینی مدارس بھی جدید انگریزی میڈیم مغربی کلچر زدہ تعلیمی اداروں کے دل دادہ نظر آتے ہیں، معلوم نہیں مولانا مودودیؒ کے وہ مضامین کہاں کھو گئے جہاں آج سے 70 سال پہلے انہوں نے ان اداروں کو قتل گاہوں سے تشبیہ دی تھی حالانکہ اس زمانے میں تو جدید تعلیمی اداروں میں اتنی گندگی اور غلاظت نہیں ہوتی ہوگی۔

وزیر اعلیٰ ہاؤس اور رائے ونڈ کے در پر بھکاریوں کی طرح کھڑے ہونے والے عوامی نمائندوں کو بہرحال عمران خان کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہیں عمران کی بدولت جاتی عمرہ کے جھروکوں سے شہنشاہ معظم کے دیدار نصیب ہوئے۔ وہ میاں صاحبان کی شہنشاہیت میں جمہوریت کے کمیوں کا کردار ادا کرتے رہیں اور جمہوریت کے استحکام اور بقا کے لیے ان کمی کمینوں کو کچھ عرصہ بعد حمزہ اور مریم، کیپٹن صفدر کے جوتے اٹھانے کے لیے تیار ہونا چاہیے کہ ''طریق کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی'' اور کبھی دوبارہ

عالم پناہ کی راہ میں کوئی قانونی شق رکاوٹ حائل ہوئی تو پھر سندھو دیش، مہاجرستان یا سرائیکستان کے لیے ان کو کسی قانون پر دستخط کرنا پڑیں گے کیوں کہ یہ سلطانی جمہور کا زمانہ ہے۔ بھٹو خاندان کے کمی بن جائیں یا پھر شریفوں کے، ویسے تو یہ سرمایہ دار اور وڈیرے اب براہ راست امریکہ کے ساتھ رابطوں میں رہنے لگے ہیں۔ ان کے لیے آقا تبدیل کرنا زیادہ سوچ بچار اور دقت کا مسئلہ نہیں ہوتا بس کسی آئی ایس آئی کے چھوٹے موٹے آفیسر کی پکار ہی کافی ہوتی ہے اور سب ضمیر کے نام پر لبیک کہتے ہیں۔ میں خاندان کا لفظ ارادتاً استعمال کر رہا ہوں کیوں کہ یہ دو خاندان ہیں، اقتدار کی حرص ان کا بنیادی وصف اور زندگی کا بنیادی مسئلہ ہے۔ یہ دو سیاسی پارٹیاں نہیں بلکہ دو حریص خاندان ہیں جو اس ملک کو جونکوں کی طرح چمٹے ہوئے ہیں۔ خدارا ان سے نجات پانے کی کوئی صورت نکالیں۔ اگر عمران جھوٹا ہے تو قوم اس کو بھی نکال باہر کرے گی، خدارا تبدیلی کے اس پہیے کو گھومنے دیں تاکہ کوئی بہتری کا سفر شروع ہو سکے۔ ان کی تیسری نسلوں کو عوام اب آقا بنانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اللہ ہماری اور اس ملک کی نگہبانی اور حفاظت فرمائے آمین۔

تبصرۂ کتب

ڈاکٹر مظفر اقبال ☆
ترجمہ وتہذیب: ڈاکٹر محمد امین

'قرآن اور مغرب' تالیف کینتھ کریگ

The Quran and the West

By Kenneth Cragg

کینتھ کریگ کی 'قرآن اور مغرب' ان اوّلیں کتابوں میں سے ایک ہے جو ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے سانحے کے بعد قرآن حکیم کو موضوع بنا کر لکھی گئی ہے اور اس واقعے کا تعلق مسلمانوں اور قرآن سے جوڑتی ہے۔ اگرچہ یہ دونوں دعوے (کہ اس سانحے کے ذمہ دار مسلمان تھے اور ان کی ذہن سازی قرآن کی مرہونِ منت تھی) ابھی تک محض مفروضے ہی ہیں [ان کے حق میں اور ان کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا ہے اور کسی غیر جانبدار اعلیٰ عدالتی یا علمی فورم نے ان مفروضوں کی ابھی تک تصدیق نہیں کی] لیکن کریگ نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اور اپنی بساط کی حد تک بات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے قرآن حکیم کا گہرا مطالعہ کر

کے یہ سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کی اس مقدس کتاب میں ایسا کون سا مواد ہے جو مسلمانوں کے اس طرح کے رویوں کی تشکیل کرتا ہے۔

مصنف اگرچہ پچھلی چھ دہائیوں سے اسلام پر لکھ رہے ہیں اور اہل مغرب کو مسلمانوں اور قرآن کے بارے مبنی براحترام رویے کی تلقین بھی کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی یہ کتاب قرآن حکیم کے بارے میں براہِ راست اور بالواسطہ قابل اعتراض جملوں اور حملوں سے بھری پڑی ہے۔ اس کا حاصل مطالعہ یہ ہے کہ وہ قرآن اور قرآنی تعلیمات کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک وہ جو اس کے نزدیک حسن اور شائستگی پر مبنی ہے اور قابل قبول ہے اور دوسرا وہ جو اسلامی معاشرے اور ریاست کے قیام و استحکام کے لیے طاقت کے استعمال کی اجازت اور ترغیب دیتا ہے اور اس کے نزدیک نا قابل قبول ہے۔ پہلا دور اس کے نزدیک قرآن کا مکی دور ہے جو طویل بھی ہے اور نبی (مکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کا اکثر حصہ بھی اس میں صرف ہوا ہے۔ اس دور کی اہم سورتوں کے موضوعات پر امن دعوت و اصلاح، جہاد بالنفس اور تعمیر شخصیت وغیرہ ہیں جب کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کا دوسرا دور (یعنی مدنی دور) مختصر بھی ہے اور اس کا موضوع ریاست و سیاست، معاشرے کی تنظیم اور جہاد و غلبہ ہے۔ مکی و مدنی سورتوں کے موضوعات کے اس فرق کی طرف اشارہ کریگ نے اپنی ۱۹۷۱ء کی تصنیف "The Event of Quran: Islam and its Scripture" میں بھی کیا تھا لیکن اب کی دفعہ اس تفریق کو اس نے

☆ ڈائریکٹر سنٹر فار اسلام اینڈ سائنس، کینیڈا

بڑے جارحانہ انداز میں نمایاں کیا ہے، جیسا کہ قرآن حکیم کے بارے میں مستشرقین کا عمومی رویہ رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پچھلی صدی میں مستشرقین نے منظم کوششیں کیں کہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا بنیادی ماخذ ہونے کے استناد کو مجروح کیا جائے اور اسے مشکوک قرار دے کر اہل علم کی نظروں سے گرا دیا جائے لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ حدیث کے بعد انہوں نے ساری توجہ قرآن حکیم پر مبذول کر دی ہے۔ قرآن حکیم کے بارے میں امریکہ و یورپ میں آج کل کثرت سے لکھا جا رہا ہے اور وہاں کی اکثر یونیورسٹیوں میں قرآن کی تدریس و تحقیق پر کام ہو رہا ہے۔ قرآن حکیم پر اہل مغرب کی اس توجہ کا سبب بلاشبہ حالیہ بین الاقوامی واقعات ہیں جن کی وجہ سے مسلمانوں اور اہل مغرب کے درمیان تلخی اور کشمکش میں اضافہ ہوا ہے۔ اور جس طرح ماضی میں صلیبی جنگوں اور یورپ پر ترکوں کے حملے کے نتیجے میں

قرآن حکیم کے مطالعے کی طرف اہل یورپ کی توجہ مبذول ہوئی تھی اسی طرح مسلمانوں اور اہل مغرب میں موجودہ کشمکش کے نتیجے میں بھی بہت سے امریکی و یورپی سیاست دانوں، دانشوروں اور مذہبی رہنماؤں نے اس حوالے سے قرآن حکیم میں دلچسپی لینی شروع کی ہے کہ 'مسلم پرابلم' [یعنی مغربی فکر و تہذیب کے عالمی غلبے کو ردّ کرنے اور دہشت گردی ختم کرنے کے نام پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف لڑی جانے والی نام نہاد جنگ کی مزاحمت کرنے والی مسلم ذہنیت] کی تشکیل و فروغ میں قرآن حکیم کیا کردار ادا کرتا ہے؟

مذکورہ مسلم رویے کی تشکیل میں قرآن حکیم کی جہاد کے بارے میں تعلیمات پر کئی مغربی تحقیقی ادارے (تھنک ٹینکس) اور سیاستدان اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں اور مذکورہ معاملے میں قرآنی نقطۂ نظر کو صحیح تناظر میں نہ سمجھنے کی وجہ سے مسلمانوں کی مدافعانہ اور مزاحمانہ کاروائیوں کو [جو درحقیقت مغرب کی ریاستی دہشت گردی، توسیع پسندی، استعماریت اور اسلام اور مسلم حکومتوں کو قوت سے کچلنے کی کوششوں کا ردِعمل ہیں] بھی قرآن سے جوڑا جا رہا ہے اور اپنے زیر اثر مسلم ممالک پر زور دیا جا رہا ہے کہ وہ جہاد سے متعلق آیات تعلیمی اداروں کے نصابات سے خارج کر دیں۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس وقت مغرب مسلم دنیا کے خلاف جو فوجی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی مہم جوئی کر رہا ہے۔ اس طرح کے علمی اور نظریاتی حملے بھی اس کا ایک حصہ ہیں جس طرح ماضی میں تحریک استشراق (Orientalsim) محض ایک علمی تحریک نہ تھی [بلکہ اس کے حقیقی مقاصد سیاسی اور تہذیبی تھے جن کا پس پردہ ہدف غلبۂ استعمار کا دوام و استحکام تھا]۔

غور سے دیکھا جائے تو مغرب میں ہونے والے قرآن حکیم پر موجودہ علمی کام کی جڑیں یورپی علمی تاریخ میں پیوست ہیں اور اس کے ڈانڈے یورپ میں انیسویں صدی میں ہونے والے مستشرقین کے اسلامی علوم پر کیے جانے والے کام سے جا ملتے ہیں۔ جو پچھلی پانچ صدیوں کے اس علمی کام کا تسلسل تھا جس کی ابتداء چودہویں صدی میں اس وقت ہوئی جب ۱۳۱۲ء میں وی آنا میں ہونے والے چرچ کونسل کے اجلاس میں بعض یورپی تعلیمی اداروں میں یونانی، عبرانی اور سریانی کے ساتھ عربی زبان کی چیئر (مسند) قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا، جس کے نتیجے میں قرآن حکیم پر کام کرنے والے مناظرانہ ذہنیت کے حامل ماہرین لسانیات سامنے آئے۔ خلاصہ یہ کہ آج کے مغرب میں قرآن حکیم پر کام کرنے والے دانشوروں کو بنیادی مواد، تحریک اور جذبہ مستشرقین کے اس کام سے ہی مل رہا ہے جو پچھلی صدیوں میں ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ آج کے دانشور خود کو 'مستشرقین' (Orientalists) کہلوانا پسند نہیں کرتے جیسا کہ دوسری جنگ عظیم تک اس کا رواج تھا۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ ایڈورڈ سعید نے ۱۹۷۸ء

میں کیا تھا۔

مغرب میں قرآن حکیم پر جو نیا علمی مباحثہ آج کل جاری ہے اس نے استشراق سے الگ شناخت پر اصرار کے لیے اپنا پیرہن بظاہر بدل لیا ہے لیکن یہ بات عقل میں آنے والی نہیں کہ کوئی علمی روایت اپنی اقدار، تصورات اور اہداف میں اپنی اصل (یعنی Mother Tradition) سے مختلف یا متضاد ہوسکتی ہے لہٰذا حقیقت یہی ہے کہ آج کی جامعات کے شعبہ ہائے مطالعۂ مذاہب ہوں یا ماضی میں قائم کردہ ایریا سٹڈی سنٹرز یا شعبہ ہائے لسانیات و ادب، ان میں آج جو کام اسلام پر ہو رہا ہے، اس کی جڑیں ماضی کے استشراق ہی میں پیوستہ ہیں لہٰذا یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ مغرب میں قرآن حکیم پر جو علمی مشق آج ہو رہی ہے اس کے ڈانڈے تحریک استشراق ہی سے جا ملتے ہیں [جس کا مغرب کے استعماری مقاصد کا آلۂ کار اور مبنی بر تعصب ہونا مبرہن ہو چکا ہے] جیسا کہ ایڈورڈ سعید نے کہا تھا کہ ''تحریک استشراق اپنے ناقص ادبی اسلوب، کمزور علمی بنیادوں اور نسل پرستانہ تعصّبات جیسے عیوب کی وجہ سے ناکام ہونے کے باوجود آج بھی جاری وساری ہے (شکریہ دی نیوز، لاہور)۔

ابلیس اپنے مشیروں سے

کیا امامانِ سیاست، کیا مساجد کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک 'ہو'

کون کر سکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں

اقبال

تالیفات ڈاکٹر محمد امین

تعلیم وتربیت صفحات قیمت

۱۔ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل۔ چند نظریاتی مباحث (دوسرا ایڈیشن)	۵۴۰	۲۵۰ روپے

اسلامی تناظر میں تعلیمی نظام کی تشکیل نو۔ ماڈل اسلامی سکول، یونیورسٹی اور نظام تعلیم کا عملی خاکہ
ثنویت کے خاتمے کا طریق کار، نفاذ اسلام اور مسلم سأۃ ثانیہ میں تعلیم کا کردار، وغیرہ

۲۔ **ہمارا دینی نظام تعلیم** ☆ ۳۱۴ ۳۵۰
دینی تعلیم کے چار وفاقوں کے ذمہ دار علماء سے طویل مشاورت
اور مباحثہ کے نتیجے میں دینی مدارس کے لیے اصلاحی تجاویز اور متبادل نصاب

۳۔ **تعلیمی ادارے اور کردار سازی** ۱۵۳ ۸۰
اس سوال کا جواب کہ جدید تعلیمی اداروں میں اسلامی نقطہ نظر سے
بچے کی تربیت اور کردار سازی کیسے کی جا سکتی ہے؟

۴۔ **جدید اسلامی نصاب تعلیم** ☆ ۲۳۱ ۲۶۰
پہلی سے بارھویں جماعت تک، سارے مضامین کے لیے،
دینی اور عصری علوم کے امتزاج پر مبنی

۵۔ **پاکستان میں تعلیم کی اسلامائزیشن** ☆ ۴۲ ۴۷

۶۔ **مطالعۂ قرآن وحدیث** (برائے جماعت اوّل تا پنجم) ۲۴۰ ۱۹۰
ہر جماعت کے لیے الگ۔ مروجہ دینیات سے الگ اور زائد مطالعہ کے لیے

۷۔ **بروشرز**
۱۔ پرائیویٹ سکولوں کے نام ایک اہم پیغام ۱۲
۲۔ طلبہ کی اسلامی تربیت۔ کیوں اور کیسے؟ ۱۶
۳۔ انگلش میڈیم۔ فائدے اور نقصانات ۱۲ ۵۰
۴۔ دینی مدارس کے نام۔ ایک اہم پیغام ۱۲
۵۔ والدین کے نام ایک اہم پیغام زیر طبع
۶۔ نوجوانوں کے نام ایک اہم پیغام زیر طبع

تربیت وتزکیہ

۱۔ **اسلام اور تزکیۂ نفس۔ مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ** ۹۰۴ ۶۰۰
تعمیر سیرت کا اسلامی منہج قرآن وسنت کی روشنی میں۔ مسلم ادارے اور
تجربات۔ مغربی فکر وعمل سے ان کا موازنہ۔ ایک علمی، فکری اور تحقیقی تجزیہ

۲۔ **ترکِ رذائل** ۲۹۲ ۱۹۰

بُرے اخلاق، ان کے اسباب، نقصانات اور ان سے بچنے کے عملی طریقے		
۳۔ **حقیقتِ تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)** ☆	۵۵	۵۲
مختصر، سادہ، عام فہم اور غیر اختلافی انداز میں اہم مسئلے کی وضاحت		
۴۔ **حقیقتِ تصوف**	۸	۵

قرآن وسنت

۱۔ **سورہ یٰسین**	زیرِ طبع	
دو رنگوں میں، بیک وقت تین تراجم (لفظی، بامحاورہ اور تفسیری) مع قرآنی عربی الفاظ کے اردو استعمالات کی نشاندہی کے		
۲۔ **Riyadh-us-Saliheen (2 Vols)**	۱۴۵۴	
۱,۰۰۰		
حدیث اور تزکیۂ نفس کی معروف کتاب ریاض الصالحین اور اس کے حواشی کا انگریزی ترجمہ		
۳۔ **Noble Quran, Part 1** ☆	۷۰	۶۰
قرآن حکیم کے پہلے پارے کا انگریزی میں لفظی ولغوی ترجمہ		
۴۔ **Noble Quran, Part 2-9** ☆	۸۳۸	۹۳۸
پارہ ۲ تا ۹ کا انگریزی میں لفظی ولغوی ترجمہ		

فقہ وقانون

۱۔ عصر حاضر اور اسلام کا نظامِ قانون ☆	۲۷۳	۳۰۰
۲۔ **Islamization of Laws in Pakistan**	۲۵۸	۲۰۰
پاکستان میں مروجہ قوانین کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے کی جدوجہد کا علمی تجزیہ، ضیاء الحق دور کا خصوصی مطالعہ		
۳۔ **السلطة التشريعية۔ دراسة مقارنة (عربی)** ☆	۱۶۹	۱۹۵
اسلام میں اجتہاد اور مغرب میں قانون سازی کے عمل کا تقابلی مطالعہ		

مسلم امہ

۱۔ **مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل**	۴۰۷	۲۵۰
اس اہم سوال کا جواب کہ مسلمان کس طرح زوال کے موجودہ گرداب سے نکل سکتے ہیں اور کس طرح دوبارہ غلبہ وعروج سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ مکمل لائحہ عمل		

۲۔ اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش۔ایک تجزیہ، ایک مطالعہ (دوسرا ایڈیشن)	زیرطبع	
۳۔ جہاد اور دہشت گردی۔ عصری تطبیقات	۱۳۰	۱۰۰
۴۔ مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ	۱۲	۸

سیاسیاتِ اسلام

۱۔ اسلام اور پاکستان ☆ پاکستان میں نفاذِ اسلام کا صحیح طریق کار	۱۲۷	۱۵۵
۲۔ اسلامی انقلاب۔ مفہوم، تقاضے اور حکمت عملی ☆	۱۳۳	۱۴۰
۳۔ سیاسی جماعتوں کی شرعی حیثیت ☆	۴۵	۵۰
۴۔ اسلام اور جدید سیاسی مسائل	زیرطبع	

اسلام (متفرق)

۱۔ رزم حق و باطل ☆ ان مسلم داعیوں اور حریت پسندوں کا تذکرہ جنہیں کج فہم مسلم حکمرانوں سے کشمکش کرنا پڑی	۱۱۸	۱۳۰
۲۔ مقالاتِ امین (دو جلدیں) ☆ ان مضامین و مقالات کا مجموعہ جو مختلف اوقات میں جرائد و اخبارات میں چھپتے رہے	۱۲۵۸	۱۳۵۰
۳۔ عصر حاضر میں تعبیر دین	زیرطبع	
۴۔ ایک نئی دینی تحریک کی ضرورت	زیرطبع	

☆ فوٹو کاپی مہیا کی جاسکتی ہے۔

۔ خرید کتب کے لیے تحریک اصلاح تعلیم کے دفتر سے رابطہ کیجیے، فون نمبر 0300-4609522

۔ مندرجہ بالا قیمتوں میں ڈسکاؤنٹ شامل ہے ڈاک خرچ شامل نہیں جو موجودہ قیمت کا ۱۵% ہوگا۔

طریق ادائی: منی آرڈر یا پے آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ، 71-A فیصل ٹاؤن، لاہور۔